قصص و مسائل

قرآن مجید سے متعلق ڈو فاضلانہ مقالات کا مجموعہ

بعد نظر ثانی اضافہ و ترمیم

(طبع ثانی)

از

عبد الماجد دریابادی

(قرآن (انگریزی و اردو) مدیر صدق لکھنؤ

ناشر:- صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ

قیمت:- دو روپیہ (عہ)

قصص و مسائل

قرآن مجید سے متعلق ۲۵ فاضلانہ مقالات کا مجموعہ

بعد نظر ثانی اضافہ و ترمیم

(طبع ثانی)

(از)

عبدالماجد دریابادی

مصنف تفسیر قرآن (انگریزی و اردو)، مدیر صدق جدید لکھنؤ

ناشر:- صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ لکھنؤ

قیمت:- ۵/ روپیہ (ٹکا)

ملنے کا پتہ

(۱)

صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ لکھنؤ

(۲)

دار المصنفین۔ شبلی منزل۔ اعظم گڈھ (یوپی)

(مطبوعہ)

یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ نظیر آباد لکھنؤ

صدق جدید

زیر ادارت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

ملک کا مشہور دینی، اصلاحی اور ادبی ہفتہ وار جس کی ہمیشہ پالیسی اور ضرورات ہند اور پاکستان دونوں جگہ انتہائی ذوق و دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے سالانہ قیمت آٹھ روپیہ ۸ ششماہی چار روپیہ آٹھ آنہ (للعہ) نمونہ مفت۔

منیجر صدق جدید کچہری روڈ لکھنؤ یوپی

فہرست

دیباچہ (طبع اول)

قرآن مجید کی تحریری خدمت کا شغل تو عرصہ سے جاری ہے۔ پچھلے
نوں دو علمی مجلسوں میں کارکنوں کی دعوت پر مقالہ سنانے کا اتفاق ہوا۔
پہلے مقالہ کا عنوان ہے "بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں" یہ رضا اکاڈمی
رامپور کے جلسہ میں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کی شام کو سنایا گیا۔ اکاڈمی مذکور کوئی
ینی و مذہبی ادارہ نہیں ایک علمی مجلس ہے۔ اس لیے اندر گفتگو صرف قرآن مجید
کے صرف علمی اثری، جغرافی، تاریخی پہلوؤں پر ممکن تھی۔ آج وہ مقالہ بہت
سے اضافوں اور ترمیمات کے بعد رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

دوسرے مقالہ کا عنوان ہے "جدید قصص الانبیا" یہ اسلامیہ کالج
شاور کی مجلس اسلامیات کے جلسۂ خصوصی میں ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء کی صبح
و سنایا گیا۔ اور آج خفیف سی تصحیح و ترمیم کے بعد تقریباً بعینہ شائع ہو رہا ہے
دونوں مقالے۔ قسطوار صدق (لکھنؤ) میں نکل چکے ہیں۔ انکے مجموعہ
ا نام قصص و مسائل تجویز ہوا ہے۔ اور یہ پہلا ایڈیشن ادارۂ اشاعت اردو

حیدرآباد دکن کو دیا جا رہا ہے۔

دونوں مقالے بعض مخلصین کے صدق طلب ہی کا ثمرہ ہیں۔ پہلا مقالہ اکاڈمی کے پرجوش و ذی صدر مولوی معین الدین صاحب لکھنوی بی اے بیرسٹر ایٹ لا و جج ہائی کورٹ رامپور) اور خادم علم سکریٹری مولوی امتیاز علی صاحب عرشی (مہتمم کتاب خانہ ریاست) کی تحریک پر تیار ہوا تھا اور دوسرا مجلس اسلامیات کے پرجوش صدر مولانا نورالحق صاحب ندوی (ناظم دینیات کالج) اور ہونہار سکریٹری محمد اسحاق صاحب کی دعوت پر۔

ان احباب کی محبت کا شکریہ ضروری ہے۔

خداوند کریم اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور رسالہ کو دینی اور علمی دونوں حیثیتوں سے نافع بنائے۔

دریاباد ضلع بارہ بنکی
جنوری ۱۹۴۴ء

عبدالماجد

دیباچہ (طبع دوم)

یہ دو مقلے آج سے کوئی ۱۲ سال قبل یکجا کتابی صورت میں اول بار شائع ہوئے تھے۔ اب انھیں کو نظر ثانی، ترمیم، اور خفیف اضافہ کے بعد از سر نو شائع کیا جا رہا ہے۔ نظر ثانی اور ترمیم عموماً لفظ و عبارت میں ہوئی ہے، اور خفیف سا اضافہ مغز و مضمون میں۔

قرآن مجید کی خدمت، علاوہ خالص دینی، فقہی، کلامی، ادبی پہلوؤں کے، علمی اثری و تاریخی حیثیت سے بھی بڑی گنجائش رکھتی ہے۔ یہ رسالہ اس منزل کی طرف ایک حقیر سا قدم ہے۔ اور اس نامہ سیاہ کے قلم سے دو رسالے حیوانات قرآنی اور جغرافیہ قرآنی کے نام سے اس کے قبل بھی اسی سلسلہ میں نکل چکے ہیں۔ انکا مخاطب اصلاً اور براہ راست جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اللہ انھیں نافع و مقبول بنائے۔

تفسیر ماجدی انگریزی اور اردو دونوں بحمد اللہ مکمل ہوئے کئی سال ہو چکے

ہیں۔ دونوں کے پہلے ایڈیشن تاج کمپنی (لاہور و کراچی) کو مٹے ہوئے ایک مدت ہوچکی، کمپنی مذکور نے انگریزی تفسیر کے صرف دو پارے اس وقت تک شائع کئے ہیں۔ اور اردو تفسیر کی دو جلدیں۔ یعنی ختم سورۃ البراۃ تک۔ اور تیسری اور چوتھی جلدیں۔ عجب نہیں کہ ان سطور کے شائع ہونے تک پریس سے باہر آجائیں۔ ان تفسیروں میں بھی مضامین، اس رسالہ سے ملتے ہوئے، بہ کثرت ملیں گے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی (ہند)
مارچ ۱۹۵۶ء

عبدالماجد

بعض قدیم مسائل

جدید روشنی میں

قرآن مجید اور علوم حاضرہ

قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دنیا کی ایک اہم ترین علمی کتاب بھی۔ مطالعے کے قابل مسلم کے لئے بھی، غیر مسلم کے لئے بھی۔ ان تیس پاروں کی ضخامت کے اندر اللہ اکبر کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ توحید و رسالت کے عقیدے ہیں، روح و جزائے عمل کے مسئلے ہیں، فقہ و قانون کی دفعات ہیں، معاشرت و اخلاق کی تعلیمات ہیں، سیاسیات کے ضابطے ہیں، معاشیات کے قاعدے ہیں، اگلوں کی حکایتیں ہیں، پچھلوں کے لئے ہدایتیں ہیں۔ اشخاص کے تذکرے ہیں، عمل و کردار پر تبصرے ہیں۔۔۔ ایک بے علم و بے مایہ ان خدمت قرآن میں اپنی بساط کے لائق کئی سال سے لگا لپٹا ہوا، جب ایسی آیتوں پر پہنچا جن کا تعلق نظر آیا۔ اسی دنیا کے گورے

ہوئے واقعات سے، اسی کائنات کے اشخاص و مقامات سے، تو طبیعت میں کرید قدرتاً یہ پیدا ہوئی کہ یہ تذکرہ کب کا ہے؟ کہاں کا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟ یہ قوم کون سی ہوئی ہے؟ یہ واقعہ جو پیش آیا، کس کیفیت کے ساتھ پیش آیا؟ تاریخ اپنی روشنی کی کوئی کرن ان واقعات پر ڈالتی ہے؟ جغرافیہ کوئی پتہ نشان ان مقامات کا اپنے نقشہ پر بتاتی ہے؟ ـــ سوالات کے جوابات جو ملے ان کا ایک مختصر سا حصہ اسی مجلس علمی کے روبرو پیش ہو رہا ہے۔ مقالہ کسی محقق کا اپنے ہمسروں اور ہمعصروں کے سامنے نہیں، آموختہ ایک ادنیٰ طالب علم کا ہے اہل علم کے سامنے، وہ بھی کچھ کچا پکا۔

بنی اسرائیل کی کائناتی اہمیت

قرآن کا خطاب دنیا کی ساری قوموں سے ہے لیکن ذکر ایک خاص قوم کا، اور ذکر بھی اس پر الطاف خداوندی کی بارش کا، اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ آتا ہے کہ گویا وہ قوم جوہر ہے، دوسری قومیں عرض۔ وہ ایک اصل ہے اور باقی سب شاخیں۔ وہ ایک مقصود ہے اور دوسری قومیں طفیلی۔

یہاں تک کہ اس قوم کو مخاطب کرکے صاف صاف ارشاد ہو گیا ہے کہ اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دے رکھی تھی'۔ نام اس قوم کا بنی اسرائیل ـــ ذوق تاریخ نے کان کھڑے کئے طبیعت کے کھوج نے سوال کیا کہ دعویٰ پر کوئی مادی دلیل؟ حاسۂ تجسس نے بیدار

ہو کر پوچھا کہ بیان کا کوئی حسی ثبوت ؟

آثارِ قدیمہ کے راوی کا بیان ہے کہ اسرائیل لقب ہے یعقوب ابن اسحٰق کا۔ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوئے ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں بھی، مسیحی عقیدہ میں بھی، اور یہودی عقیدہ میں بھی۔ نام عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی معنی ہیں۔ خدا کے بندے یا خدا کے پہلوان کے۔ پوتے تھے حضرت ابراہیم پیغمبر کے۔ سالِ پیدائش سنہ ۲۰۰۰ ق م ہے۔ یعنی آج سے ۳۹۴۱ سال قبل[1] وطن فلسطین، یا قدیم بولی میں کنعان جو اُس وقت ملک شام کا ایک سرسبز صوبہ تھا۔ دو بیاہتا بیویاں تھیں اور دو شرعی باندیاں۔ ان چار سے اولاد کل ملا کر بارہ بیٹے ہوئے۔ ان سے جو عظیم الشان نسل چلی وہ تیزی کے ساتھ پھیلی اور بڑھی۔ اسی کا نام بنی اسرائیل پڑا۔ دنیا کے اتار چڑھاؤ جس طرح سب دیکھتے ہیں، ان لوگوں نے بھی اپنی تاریخ میں دیکھے کبھی گرے، کبھی ابھرے۔ آج جیتے کل ہارے۔ ابھی حکومت کی، ابھی غلامی سہی۔ اس حیثیت سے ان کی تاریخ ویسی ہی ہے۔ جیسی دنیا کی اور ساری قوموں کی۔ اور اس معنی میں انہیں کوئی خاص فضیلت کسی دوسری قوم پر نہیں۔ لیکن عروج و زوال کے سارے چکروں کے باوجود ایک چیز ان کی

---

[1] اب سنہ ۱۹۵۲ء تک ۳۹۵۲ سال قبل

ہمیشہ قائم رہی۔ نبوت کی شمع جو ان کے خاندان میں ایک بار جل چکی تھی، بجھی نہیں برابر روشن رہی۔ نبی ان کے ہاں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ افراد انبیاء کے مقابلہ میں عداوتیں، بغاوتیں، انھوں نے برابر رکھیں، آج اس نبی کو جان سے مار ڈالا، کل اس نبی کو وطن سے نکال دیا۔ لیکن نفس نبوت کے قائل برابر بنے رہے۔ عمل میں باغی، طاغی، غدار کیسے ہی ثابت ہوئے ہوں، لیکن عقیدہ میں مسئلہ نبوت کے منکر نہ ہوئے۔

افضلیت کا معیار

معاصر قومیں، ترقی کرنے والی قومیں، دولت و حکومت والی قومیں، متمدن پڑھی لکھی قومیں مصر میں بھی تھیں اور ہندوستان میں بھی، عراق میں بھی اور ایران میں بھی ان کے کان رسول کے پیام اور نبی کے کلام سے ناآشنا رہے۔ ان کے ہاں اوتار آتے رہے۔ مظہر خدا پیدا ہوتے رہے۔ یعنی خالق کائنات خود کسی نہ کسی قالب میں ظاہر ہوتا رہا۔ کسی مخلوق کے جسم کے اندر حلول کرتا رہا۔ لیکن اس ساری مدت میں یہی ایک قوم اسرائیل ایسی رہی۔ جس میں نبی پر نبی، اور رسول پر رسول آتے رہے۔ محض پیامبر تھے۔ کسی بالا و برتر کا پیام لاتے رہے، کسی قوی و قادر کا کلام سناتے رہے ـــــ جو وسیع ہو زمین کی ساری وسعتوں سے، بلند تر آسمان کی ساری رفعتوں سے منزہ ہو جسم سے، جان سے، مکان سے، اس کے لئے یہ ممکن ہی کیونکر ہے

کہ وہ اپنے کو قالبوں میں منتقل کرتا رہے! ــــ یہی راز ہے اس کا کہ یہی ایک قوم بہ حیثیت قوم بھی رہی عقیدۂ توحید پر، اور بچی رہی مظاہر پرستی سے، عناصر پرستی سے، صنم پرستی سے، شجر پرستی سے، بخلاف مصر و کلدانیہ ایران و ہندوستان اور آخر میں یونان کے. جغرافی حیثیت سے ان سب کے درمیان، انہیں سے گھری ہوئی، لیکن عقائد میں ان سب سے الگ تھلگ، یہی ایک قوم ایسی رہی جو کلمہ پڑھتی رہی خالق کی تنزیہ و تقدیس کا، اس حال میں کہ ہمعصر قومیں تشبیہ و تجسیم کی بھول بھلیاں میں اپنے کو گم کرتی گئیں توحید کا جھنڈا اسی کے ہاتھ میں بلند رہا. تنزیہ اور توحید کا ہے بھی چولی دامن کا ساتھ!

بس یہی خصوصیت نسل اسرائیل کی وہ ہے جس نے اسے شرف امتیاز دے رکھا ہے تمام دوسری نسلوں پر، نسل انسانی کے سارے دوسرے کنبوں، خاندانوں پر. قرآن نے اسی کو تعبیر کیا ہے اقوام عالم پر افضلیت سے. قرآنی معیار افضلیت اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، صنعت و حرفت، مال و دولت، حکومت و تجارت کے سکے اور جب تعلیم و ملکیت میں بھی زوال ہو لیا، قرآن کا معیار بزرگی تو یہی توحید کی دولت ہے اور ایمان باللہ کی نعمت. کیا مضائقہ اگر اس قوم کی تاریخ کے صفحات خالی ہیں. ادب اور علم کے ترانوں سے اور سطو

اور افلاطون کے افسانوں سے، ہومر اور کالیداس کی بساط بزم سے اور دارا اور سکندر کے میدان رزم سے۔ قرآن کی نظر میں تو قدر موسیٰؑ و ہارونؑ داؤدؑ و سلیمانؑ، الیاسؑ و زکریاؑ، یحییٰؑ و عیسیٰؑ کی ہے۔

قوم و امّت کا فرق

ابھی گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل نام ہے ایک خاص خاندان کا۔ حافظہ میں پھر ایک بار اس حقیقت کو تازہ کر لیجئے کہ بنی اسرائیل نام کسی مذہب و دین کا نہیں، کسی عقیدہ و آئین کا نہیں، نام ہے ایک مخصوص نسل کا، اس لئے امت محمدی اور قوم اسرائیل کے درمیان تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اور قرآن کے جن طلبہ نے ان بحثوں کو چھیڑا ہے، وہ بیچارے خلط کر گئے نسل اور دین کے درمیان۔ اور ان کے ذہن سے یہ حقیقت یکسر نظر انداز ہو گئی کہ امت محمدی کے فضائل جو کچھ بھی ہیں، وہ افراد کے اختیار کیے ہوئے دین، عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے ہیں۔ نہ کہ افراد کی غیر اختیاری نسلیت و قومیت کی بنا پر!

اب ایک نظر اس پر بھی کر لیجئے کہ قرآن میں ذکر بنی اسرائیل کا خصوصیت سے کس موقع پر ہوتا ہے۔ پارہ اول کے سب سے پہلے رکوع میں مذکور ہے کہ انسانیت کی تقسیم خدا کے ہاں صرف دو گروہوں میں ہے۔ ایک گروہ ہے اطاعت شعاروں کا، وفاداروں کا، ایمان والوں کا۔ دوسرا گروہ

باغیوں کا، طاغیوں کا، منکروں کا۔ دوسرے رکوع کا مضمون یہ ہے کہ نوع انسان کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ زبان سے وفادار، اور دل سے غدار ہیں یہ لوگ بالکل باغی اور منکر، لیکن دھوکا دینے کے لئے وردی وفاداری کی پہن لی ہے۔ گویا حق کے قبول و رد کے معیار سے کوئی تیسری تقسیم ممکن ہی نہیں، قسمیں کل وہی دو ہیں۔ اب تیسرے رکوع میں قرآن اپنی اصل دعوت یعنی پیام توحید و رسالت کو پیش کرتا ہے۔ اور مخاطب سارے عالم انسانی کو بہ حیثیت مجموعی کرتا ہے۔ چوتھے رکوع میں بیان ہے انسانیت کی تاریخ کا۔ یعنی انسان کو پیدا کیا گیا فلاں خاص طریقہ پر فلاں خاص مقصد کے لئے۔ اب آگے قرآن کو یہ مضمون لانا ہے کہ نسل انسانی میں سے ایک خاص خاندان اس دعوت کے لئے چن لیا گیا۔ دنیا میں اس پیام کی منادی اسی مخصوص قوم کے ذریعہ سے کی گئی۔ قرن پر قرن، اور صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں۔ اور وہ مخصوص قوم اپنی مسلسل نافرمانیوں سے اپنی پیہم عہد شکنیوں سے اپنے کو اس نعمت کا نااہل ثابت کرتی گئی موقع پر موقع ملتے رہے، اور ہر نئی مہلت مزید سرکشی ہی پر ختم ہوتی رہی اس لئے اب نظام نو ہے، وہ نعمت، اس مخصوص نسل سے چھین کر ایک دوسری نسل کے سپرد کر کے واسطے سے ساری دنیا کے لئے بلا امتیاز نسل و قوم، عام کی جا رہی ہے۔ اب ایک عالمگیر برادری کا ساری دنیا کے لئے

بھیجا جا رہا ہے۔ یہ وہ پیامبر ہے جس کے بعد کوئی پیام نہ آئے گا۔ آئندہ اعتبار صرف افراد کے عقاید و اعمال اختیاری کا کیا جائے گا۔ کوئی اسرائیلی ہو اسمٰعیلی ہو، آریائی ہو، تاتاری ہو، غرض کسی نسل کا بھی ہو، جو بھی صحیح راہ اختیار کرلے گا، بس نجات اسی کی ہے۔ اس سارے مفہوم کے شروع کر دینے کے لئے بہترین جگہ کون سی ہو سکتی تھی؟ یقیناً وہی جہاں خلقت انسانی اور مقصد آفرینش کا بیان ختم ہوا ہے — یہی سے یہ ہے کہ خلقتِ انسانی اور مقصد آفرینش کے معاً بعد ادھر چوتھا رکوع ختم ہوا، ادھر پانچویں رکوع کے ساتھ اس مخصوص انعام یافتہ نسل بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے، اور پھر بہت دور تک سلسلہ ان کی شرارت و سرکشی کا چلا جاتا ہے — ترتیب، مقتضائے حال کے عین مطابق اور بیان، حُسنِ بیان کے ہر تقاضہ کو پورا کرنے والا۔

ایک اہم نکتہ آگے چل کر قرآن میں ذکر "یہود" کا آتا ہے، اور بار بار آتا ہے۔ اور بنی اسرائیل کا تذکرہ بھی موقوف نہیں ہوا ہے، وہ بھی برابر آئے جاتا ہے۔ تو کیا ایک ہی مفہوم کے لئے قرآن دو لفظ ادل بدل کر لا رہا ہے؟ کبھی یہ نام لے دیا، کبھی وہ؟ لیکن ایسے بلیغ اور پُرحکمت کلام سے یہ ہے بہت بعید۔ قرآن تو کوئی لفظ بیکار لاتا ہی نہیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ ہے یہ کہ ان دونوں لفظوں کے مفہوم بالکل

الگ الگ ہیں "بنی اسرائیل" نام ہے ایک مخصوص نسل کا۔ ایک متعین قبیلہ کا۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس کا ایک ماضی رہ چکا ہے "یہود" اس کے برعکس نام ہے ایک مذہبی فرقہ کا، ایک دینی اُمت کا۔ اس کے کچھ مخصوص عقاید ہیں، اس کا ایک مخصوص مسلک ہے۔ اب سیاق کلام جہاں جہاں "تاریخی" ہے۔ قومی ہے، مقصود ان کے نسلی کارناموں کو یاد دلا کر انھیں شرم دلانا ان پر حجت قائم کرنا ہے۔ عرب نسل اور بنی اسمٰعیل کے ساتھ اُن کے حسد و تعصب کا ذکر کرنا ہے۔ ایسے کل موقعوں پر نام بنی اسرائیل کا آیا ہے، برخلاف اس کے سیاق جہاں جہاں مذہبی ہے مقصود ان کے باطل عقائد کی پردہ دری ہے، اشتراک ان کا نصاریٰ کے ساتھ دکھایا ہے، تقابل ان کا مشرکین سے ہے۔ مومنین سے، غرض کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ کیا گیا ہے، ایسے ہر موقع پر نام یہود کا لیا گیا ہے!۔۔۔ شروع سے آخر تک قرآن کی آیتوں کا استقصاء کر جایئے، ہر جگہ یہی التزام نظر آئے گا۔

اَلَّذِیۡنَ هَادُوۡا کی تفسیر

اور سنیئے سارے قرآن میں کہیں کہیں یعنی کوئی آٹھ دس جگہ بجائے اسم الیہود کے ایک فقرہ اَلَّذِیۡنَ هَادُوۡا آیا ہے، یعنی وہ لوگ جو یہودی بن گئے، جنھوں نے یہودیت اختیار کر لی۔ پھر وہی سوال کہ

ایک مفہوم کے لئے دو لفظ کیسے؟ —— پھر وہی جواب کہ دونوں کا بعینہ ایک مفہوم ہی نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ یہودی مذہب، مسیحیت اور اسلام کی طرح تبلیغی مذہب نہیں بلکہ ہندومت کی طرح نسلی مذہب ہے، نسل اسرائیل نے اپنے لئے جو قومی مذہب اختیار کیا۔ بس اسی کا نام یہودیت پڑ گیا۔ اب ہوا یہ کہ گرد و پیش بہت سے لوگ نسلاً اسرائیلی نہ تھے، اس لئے باقاعدہ یہودی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن یہود کا زمانہ اقبال کا تھا۔ اور اقبال کا اثر پڑوسیوں پر پڑنا لازمی تھا یہود کے فنون اور صنعتوں سے، ان کی آسمانی کتابوں کے علوم اور حکمتوں سے، اور خود ان کی دولت و امارت کی چمک دمک سے ان ہمسایہ قوموں کی نظریں ایسی خیرہ ہوئیں، کہ انھوں نے بے اختیار طور طریقے، تہذیب و معاشرت، زبان و تمدن، یہاں تک کہ عقائد و اعمال بھی انھیں کے اختیار کر لئے، اور رفتہ رفتہ یہودیت کے اندر جذب ہوگئے، انگم ہو گئے۔ جیسے آج سے کچھ روز پیشتر ہندوستان میں انگریزوں کے دور اقبال میں سکڑوں ہندوستانی دیکھتے دیکھتے "صاحب بہادر" بن جاتے تھے۔ یا پھر خود بعض فرنگیوں اور فرنگنوں کی مثالیں بھی اسی ہندوستان میں ملیں گی کہ ہندو مذہب اور ہندو رسم و رواج ایسے پسند آئے کہ سناتن دھرم باضابطہ قبول کئے بغیر انھوں نے بولنا، چالنا،

کھانا پینا، رہنا سہنا، سب طور طریقہ ہندوؤں کے اختیار کر لئے اور عملاً بالکل ہندو ہو گئے، یہود کے عروج و اقبال کے زمانے میں قبیلے کے قبیلے اُن کے ہمسایوں کے ایسے تھے، جو اسی طرز پر رفتہ رفتہ یہودیت میں داخل ہو گئے تھے۔ یا یوں کہئے کہ یہودیت ان کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ حجاز کے شمال میں، نیز وسط میں ایسے عرب قبیلے متعدد تھے جو اپنی عربیت چھوڑ، بے تکلف یہودیت میں غرق ہو گئے تھے ـــــ قرآن نے لحاظ اس نازک فرق کا بھی رکھا۔ اور جہاں کہیں موقع اس قسم کے لوگوں کی تذکیر یا تنبیہ کا ہوا، وہاں بجائے الیہود کے اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا ہی استعمال کیا۔

"نصاریٰ" کی تحقیق

یہود کے علاوہ ایک دوسرے مذہبی فرقہ کا نام بھی قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اور وہ "نصاریٰ" ہے۔ اکثر انگریز مترجمین قرآن نے (اور ان میں بعض بڑے مشہور فاضل بھی ہیں) بے تکلف اس کا ترجمہ انگریزی میں Christians سے کر دیا۔ اور اردو میں بھی نصرانی کو مسیحی کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اگر قرآن کو ذکر "مسیحیوں" کا کرنا ہوتا تو خود یہی لفظ وہ کیوں نہ لے آتا؟ اسے چھوڑ خواہ مخواہ دوسرا لفظ کیوں تلاش کرتا؟ اصل یہ ہے کہ جس مت یا مسلک کا نام مسیحیت چل پڑا ہے، وہ مذہب نہ حضرت

مسیح کا ہے، نہ اور کسی نبی برحق کا۔ حضرت مسیح کے ساتھ اس کی نسبت تو محض نام کی ہو۔ یہ مذہب چلایا ہوا پال یا پولوس طرطوسی کا ہے اور اس کو حضرت مسیح کی صحبت یا حواریت الگ رہی، زیارت بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ قرآن نے اس مذہب کا کوئی مرتبہ تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ جہاں ذکر تثلیث پرستوں کا لانا منظور ہوا ہے، وہاں عام کافروں کی طرح ان کے حق میں بھی کفر محض کی صراحت کر دی ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یا لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وغیرہا۔ بہ خلاف اس کے اس نے نصرانیت کی ایک خاص حیثیت مثل یہودیت کے اور اس کی ہم سطح تسلیم کی ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو نصاریٰ کی گویا مدح بھی کی ہے اور انہیں یہود اور مشرکین دونوں پر علانیہ ترجیح دی ہے" نصاریٰ" سے اسکی مراد حضرت مسیح کو ابن اللہ نہیں، نبی ماننے والا وہ قدیم فرقہ ہے جو ابتدائی چند صدیوں تک موجود رہا۔ انگریزی میں ان کو Nazarenes کہتے ہیں۔ حضرت مسیح کا وطن تھا قصبۂ ناصرہ ملک شام کے ضلع ارض جلیل کا انگریزی تلفظ Nazareth ہے۔ اسی وطن کی نسبت سے حضرت مسیح بھی یسوع ناصری مشہور ہوئے، جیسے آج قادیان کی نسبت سے مرزا ئے قادیانی۔ اور جس طرح آج مرزائے قادیانی کے ماننے والوں کا لقب بھی قادیانی پڑ گیا ہے، حضرت یسوع ناصری کے بھی ماننے والے

شروع شروع میں نصرانی ہی کہلائے۔

اصلی انجیل پر روشنی یہ فرقہ ایک خاصی حد تک حضرت مسیحؑ کی تعلیمات پر قائم رہا، اور شرک سے تو بہرحال محفوظ رہا اس نے مسیحؑ کو مسیح اور نبی ہی مانا۔ نہ خدائی میں بقدر ⅓ شریک کیا۔ اور نہ خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ یہ فرقہ شام و اطراف شام میں تیسری صدی عیسوی تک اپنے اسی نام سے زندہ رہا۔ پھر اسے مخالفین حقارت سے ابیونیہ Ebonites کہنے لگے۔ (عبرانی میں اس کے معنی مفلس و نادار کے ہیں) مسیحی تاریخوں میں آتا ہے کہ کوئی دو صدیوں تک اور زندہ رہنے کے بعد یہ فرقہ، بہ حیثیت ایک مستقل فرقہ کے گم ہوگیا۔ یہ بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ موجودہ مروج انجیلوں کے علاوہ کوئی انجیل یونانی و لاطینی میں ترجمہ کی ہوئی نہیں بلکہ اپنی اصل زبان میں اس فرقہ کے پاس موجود تھی۔ اور عجب نہیں کہ حضرت مسیحؑ والی اصل انجیل وہی ہو۔

صابی، کون تھے؟ یہود و نصاریٰ کے ساتھ دو جگہ قرآن میں ایک تیسرا نام اور بھی آیا ہے: صابیوں کا۔ اور ان دو فرقوں کی طرح انھیں بھی بعض حالات کے ماتحت نجات کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ یہ صابی، کون تھے؟ اقوال ان کے باب میں مختلف نقل ہوئے ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشرکون کا کوئی فرقہ تھا۔ حالانکہ

یہ محال ہے کہ قرآن کسی مشرک فرقہ کی ہمت افزائی کسی درجہ میں بھی کرے عراق و اہل عراق کے مذہبوں پر انگریزی کتابوں کے بہت سے ورق اُلٹنے پلٹنے کے بعد ابھی حال میں یہ کھلا کہ یہ اہل توحید کا ایک باطنی فرقہ تھا عراق میں آباد۔ پہلے یقیناً بڑی آبادی رکھتے ہوں گے۔ چند ہزار کی تعداد اب بھی باقی ہے۔ بصرہ، قطا اور سوق الشیوخ وغیرہ میں۔ انگریزی میں انہیں Mandeans کہتے ہیں۔ اور عربی میں مندیہ۔ اور چونکہ توحید کے پوری طرح قائل ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر سلسلۂ نبوت کے بھی بعض انبیاء کو صراحت کے ساتھ مانتے ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کو۔ ایک مذہبی غسل، عیسائیوں کے بپتسمے کی طرح، ان کے ہاں بھی بار بار ہوتا ہے اور اس مناسبت سے یہ فرقہ مغتسل بھی کہلاتا ہے ـــــ اب جاکر قدر ہوئی امام ابو حنیفہ رحمۃ کے اس فتوے کی، کہ صابیوں کا ذبیحہ بھی جائز ہے، اور ان کی عورتوں سے شادی بھی گویا عملاً یہ اہل کتاب کے حکم میں داخل ہیں۔ آخر امام صاحب بھی تو اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ خداداد فراست ذہانت۔ طباعی کے علاوہ مقامی واقفیت اور باخبری بھی آپ سے بڑھ کر کس کو ہو سکتی تھی؟

واقعہ "خروج" بنی اسرائیل سے مفصل تعارف، کچھ قبل ہو چکا۔ اب آیئے، کچھ دیر ان کا ساتھ انکی دشت نوردیوں

تھا بھی وہ یہیں۔ ولادت مسیحؑ سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل کا زمانہ ہوگا یا نامور فرنگی فاضل سر چارلس مارسٹن کے جدید تخمینہ کے مطابق سنہ ۱۴۴۰ ق.م کہ اس قوم نے اپنے وطن اختیاری ملک مصر سے مکمل ہجرت اپنے ملک آبائی شام کی طرف کی۔ مصر میں یہ چین کے ساتھ چار ساڑھے چار سو برس سے رہتے چلے آرہے تھے۔ حضرت یوسف کے وقت سے مگر اب فرعونی راج کی سخت گیریوں سے تنگ آ چکے تھے۔ فرعون نام کسی فرد واحد کا نہیں، لقب ہے اس عصر کے مصری ملوک وسلاطین کا۔ جیسے اب شاہ مصر "خدیو" کہلاتے تھے۔ یا کچھ روز قبل جرمنی کے تاجدار "قیصر" اور روس کے "زار" کہلاتے تھے۔ فرعون کے لفظی معنی مصری زبان میں 'راع' دیوتا کے اوتار کے تھے۔ اور 'راع' یا انگریزی تلفظ میں Ra مصر کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ ہندوستان کے سورج دیوتا اور ایران اور روم کے Mithar دیوتا کے مرادف۔

بہرحال اسرائیلی اب مصر سے چلے۔ حضرت موسیٰؑ بن عمران پیغمبر انکے رہبر و رہنما ہوئے۔ ان کی تعداد حسب روایت توریت ۶ لاکھ تھی۔ بوڑھے، بچے، مرد، عورت سب ملاکر۔ سڑکیں کچھ اس زمانے میں آج کل کی سی صاف، شفاف، آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی تو تھیں نہیں۔ پھر رات کا وقت اور تعاقب کی دہشت مستزاد۔ چلے تو راستہ بھول گئے

اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف ابھی اور بڑھتے چلے جاتے، اور اس کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مشرق کی طرف مڑتے، اور اس طرح خشکی ہی خشکی فلسطین پہنچ جاتے، یہ پہلے ہی سے مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اب سامنے سمندر تھا۔ سمندر سے مراد دریائے نیل نہیں، جو اسرائیلی آبادی کے علاقے جاشان Goschen سے مشرق نہیں مغرب میں تھا۔ بلکہ مراد ہے بحر قلزم یا اور زیادہ صحیح پتہ جاننا چاہیئے، تو بحر قلزم کے شمالی سرے کا وہ مغربی دو شاخہ جس کے بعد اب نہر سوئز شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت خشکی تھی۔

فرعون کی غرقابی

یہاں پہونچے ہی تھے، کہ پیچھے سے شاہی فوج کے دستوں نے آ لیا۔ مصریوں کا لشکر جرار موجود اور ہز امپیریل میجسٹی فرعون مصر بنفس نفیس اس کے کماندار۔ گھوڑوں کے فوجی رتھ اور خود گھوڑے اس وقت کے خاص جنگی سامان تھے، یہ سب حاضر، اعداد ان کے توریت میں دیئے ہوئے ہیں۔ اسرائیلی اسی حیص و بیص میں تھے کہ اب کیا کریں اور کہاں اپنے کو چھپائیں، کہ اشارۂ غیبی پا، ان کے رہبر اور خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ نے بے تکلف قدم سمندر میں ڈال دیا۔ اور آپ کے نقش قدم پر آپ کی ساری قوم بھی ہولی۔ سمندر نے راستہ دیدیا۔ پانی پھٹ کر بیچ میں خشکی ہو گئی۔ اب بھی زلزلہ کے اثر سے دریا کا پانی کئی کئی منٹ بالکل غائب ہو جاتا ہے، بہر حال بحری زلزلہ ہو یا کوئی اور سبب اس سے بھی خشکی تر،

مسبب الاسباب کی تائید غیبی سے قوم اسرائیل سمندر پار کو گئی لیکن جب اس کی تقلید فرعونیوں نے کرنی چاہی، تو وہی پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں پھر آپس مل گئیں، اور جس طرح پچھلی جنگ عظیم میں مشہور جہاز ٹائینک Titanic باوجود ہر تدبیر و احتیاط کے غرقابی سے نہ بچ سکا تھا۔ فرعون اور فرعونیت کا سفینہ بھی ڈوب کر رہا!

مَن و سلویٰ کا نزول

فلسطین ابھی دور تھا۔ لیکن اسرائیلی اب جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ چکے تھے، یہ وہ علاقہ ہے جو ملک عرب اور بحر روم اور مصر اور فلسطین کے چوراہے پر واقع ہے اور اسرائیلی اسی علاقہ میں سالہا سال اپنے خیمے ڈیرے لئے ہوئے آج یہاں کل وہاں، خانہ بدوش اور بدویانہ تمدن کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس نیم تمدن زندگی میں کھانے پینے کے سارے انتظامات کہاں ممکن تھے؟ حالانکہ مصر میں رہ کر یہ خوگر انہیں کے ہو چکے تھے لیکن قدرت کے انتظامات ہر بشری تدبیر پر غالب اور ہر انسانی عقل سے ماوراء ہی ہوتے ہیں۔ اس علاقہ کا ایک خاص پرندہ بٹیر ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں، بہت نیچا رہتا ہے۔ زیادہ اڑنے کا دم بھی نہیں رکھتا، تھک کر جلد نیچے گر جاتا ہے۔ بغرض

شکار کر لینا اس کا ہر حیثیت سے آسان. شمالی سفر اس کا مصر سے فلسطین کی طرف عموماً مارچ میں ہوتا ہے، اور جنوبی سفر فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں. عربی میں اسی جانور کو سلوی کہتے ہیں. اسرائیلیوں کو یہ نعمت گھر بیٹھے ملنے لگی. نہ طویل سفر کی دقتیں، نہ سامان شکار تیار کرنے کی زحمتیں آرام سے اپنے پڑاؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ بٹیر آ کر خود بخود گرنے لگے اور یہ لگے انھیں پکڑنے اور بھون بھون کر انکے کباب بنانے. مارچ و اپریل میں انکی شمالی پرواز پر رات کے وقت ہوتے تھے. سمندر کی تیز ہواؤں کے تھپیڑے انھیں بآسانی اسرائیلی کیمپ تک پہونچا دیتے. گوشت خوب چربی دار ہوتا. اسلئے رکھنے سے جلد خراب ہو جاتا، تازہ ہی کھانے کے قابل ہوتا. اس لذیذ سالن کے ساتھ ساتھ ایک اور انتظام بھی ان کے لئے قدرت کے مطبخ سے ایک خاص قسم کی روٹیوں کا ہو گیا. ایک چیز ہوتی ہے من یہی نام عربی میں بھی ہے اور یہی اسرائیلیوں کی زبان میں بھی. سفید سفید دیکھنے میں گوند کی سی. لیکن مزے میں لطیف و لذیذ. رات کو اوس کے بعد یہ درختوں پر گرتی اور صبح کو پتوں پر اس کی ٹکیاں جمی جمائی کھانے کو مل جاتیں ـــــ یہ چیز نایاب اب بھی نہیں ہوئی ہے. ان علاقوں میں کچھ نہ کچھ اب بھی مل جاتی ہے

بارہ چشمے

سینا کا علاقہ زیادہ متمدن اور سرسبز تو کبھی بھی نہ تھا. بلکہ بعض خطے تو بالکل ہی بے آب و گیاہ تھے. خشک بعض

چلتے چلتے ایک بار قیام ایک ایسی منزل پر ہوا۔ جہاں کھانا تو کھانا، پانی تک نظر نہ آیا۔ پیاس کی شدت جیسی ہوئی ہو گی۔ ظاہر ہے۔ نام اس مقام کا توریت میں حرب درج ہے۔ انگریزی تلفظ میں Horeb۔ سب نے آ کر گھیر لیا اپنے رہبر پیمبر کو۔ ملا کی دوڑ مسجد۔ بندہ کا سہارا دعا۔ موسیٰ نے دعا کی اس حاجت روا سے جس پر پہاڑ کا جوف اور ہر پتھر کا بطن آئینہ ہے۔ حکم ملا کہ اس وادی کو ہماری رحمت کے چشموں سے محروم نہ سمجھو۔ سامنے کی چٹان پر جاؤ۔ اس پر اپنے عصا کی ضرب لگاؤ۔ پھر دیکھو کیسا پانی ابلتا ہے۔ آپ گئے تعمیل ارشاد کی۔ پانی نکلا، اور نکلا بھی تو اس تجلی حکمت کے ماتحت کہ ایک نہیں پورے بارہ دھار سے پھوٹ بہے! ــــ ٹھیک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی مناسبت سے!

توریت میں ذکر تعداد کا نہیں، اس لئے قرآن کے معترضین ومعاندین بول اٹھے کہ قرآن نے یہ ذکر بارہ کی تعداد کا کہاں سے کر دیا! خدا کی شان کہ اگلوں کے اس انکار کا جواب پچھلوں نے اپنی تصدیق سے دیدیا جارج سیل قرآن مجید کا پرانا انگریزی مترجم ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اپنے حاشیہ میں لکھتا ہے:۔

"ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، صراحت سے بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلا تھا"۔

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ نقل کرتا ہے:۔

چٹان میں اس وقت بھی چوبیس سوراخ موجود ہیں، ۱۲ ایک پہلو پر ہیں، اور بارہ ان کے مقابل جانب:

یہ شہادتیں سترہویں اور اٹھارویں صدی کی تھیں، انیسویں صدی میں دنیائے مسیحیت کے ایک اور ممتاز رکن پادری ڈین اسٹینلی Dean Stanley ہوئے ہیں۔ صدی کے وسط میں ارض تورات کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس سفر کیا، اور اپنے مشاہدات تحقیقات کو ایک مستقل تصنیف sinai and palestine کے نام سے شائع کیا قرآن کی نہیں، بائبل کی تائید و نصرت میں۔ اس میں اس چٹان کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:۔

یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے۔ دامن سفسف کے قریب۔ بجا Leja کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور رخنے جا بجا پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مٹے ہوئے ہیں۔ کچھ بڑے ہیں، کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں، اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس۔ سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ

اشارہ انھیں تنگانوں کی طرف ہے۔ (ص ۳۶، ۳۰)

عہد نبوی دو صدی نہیں، ۳۳، ۳۴ صدیاں گزر جانے کے بعد اگر تنگانوں کے دورویہ نشان بجائے ۲۴ کے ۲۰ یا ایک رویہ نشان بجائے ۱۲ کے ۱۰ رہ گئے ہوں، یا دیکھنے والے کو اتنے ہی نظر آئے ہوں۔ تو یہ بیان قرآنی کی تردید و تغلیط ہوئی یا عین تائید و توثیق؟

سبت شکن یہود کو سزا اسرائیلیوں کے ساتھ دشت پیمائی سے طبیعت ملول ہوگئی ہوگی۔ اب اس قوم کے عہد ترقی و تمدن کی طرف آجایئے۔ قرآن مجید اس قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

تم اپنے لوگوں میں سے ان سے تو خوب واقف ہی ہو۔ جنھوں نے سبت کے بارے میں احکام سے تجاوز کیا تھا۔ سو ہم نے انھیں حکم دیا کہ بن جاؤ ذلیل بندر۔

سبت کہتے ہیں ہفتہ کے ساتویں دن، شنبہ یا سنیچر کو۔ شریعت یہود میں یہ دن ایک بڑا مقدس دن تھا۔ اور تقدس کے معنی یہ تھے کہ اس روز سارا دنیوی کاروبار بند رہے (اور اسی میں شکار کھیلنا بھی

آگیا) اور یہ دن تمام تر عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے۔ یہود اس قانون کو بار بار توڑتے تھے۔ مچھلی کا شکار ایک حیلہ کے ساتھ اس روز بھی کیا کرتے تھے۔ آخر میں انھیں اپنی اس قانون شکنی کا خمیازہ بہ صورت عذاب بھگتنا پڑا۔ آیت قرآنی میں تذکرہ اسی عذاب کا ہے لیکن تفصیل اس کی نہ قرآن میں درج ہے۔ نہ تاریخ میں نظر سے گزری۔ روایتوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ واقعہ حضرت داؤدؑ کے زمانے کا ہے۔ وہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی ان کا سال وفات ۹۶۲ قبل مسیح ق۔م ہے۔ ان کے عہد کی مفصل و مکمل تاریخ محفوظ نہیں۔ اس لئے اگر اور بہت سے واقعات کی طرح اس کا تذکرہ بھی گم ہو گیا ہو۔ تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔

روایتوں میں ذکر مچھلی کے شکار کا بار بار آیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کوئی مقام لب سمندر ہو گا۔ اور قیاس کی حاجت بھی نہیں۔ خود قرآن ہی نے دوسری جگہ کَانَتْ حَاضِرَۃَ الْبَحْرِ کہہ کر اسے صاف کر دیا ہے حضرت داؤدؑ کا رقبہ سلطنت، تاریخ کے طلبہ کو معلوم ہے کہ بحر روم (Mediteranian) اور بحر قلزم Red-sea دونوں کے مشرقی ساحلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے وہ مقام بھی جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ یہیں کہیں ہو گا۔ اسلامی روایتوں میں نام ایلہ کا آیا ہے۔ اور توریت میں ذکر ایلات Elath کا آتا ہے یہ ایک بندرگاہ تھا۔ خلیج عرب کا علاقہ

ادوم Edom میں. اور یہ واضح رہے کہ خلیج عرب خود نام ہے بحر قلزم کے شمالی شاخسانہ کا. اب نقشہ میں ان ناموں کا کوئی شہر نہیں ملتا. نہ ہمارے مفسرین کے ایلہ کا، نہ بائبل کے ایلات کا. جغرافیہ کی اصطلاحیں بھی آخر ابدیت سے لئے نہیں ہوتیں. ۲۹ صدیوں کے بعد جغرافی نام اگر اپنی قدیم صورتوں میں نہ باقی رہ جائیں، تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں. اب نقشہ پر جو نظر دوڑائیے تو اس میں بحر قلزم کے شمالی حصہ کا جو مشرقی دوشاخہ ہے اس کے ساحل پر ایک مشہور بندرگاہ عقبہ دکھائی دیگا. یہی عقبہ پرانی بولی میں ایلات یا ایلہ تھا. درمیان میں رومیوں کے عہد حکومت میں اسکا کچھ اور نام بھی رہ چکا ہے.

زمان و مکان کے اس تعین کے بعد قدرۃً سوال نفس واقعہ کی کیفیت وقوع سے متعلق پیدا ہوتا ہے. یعنی آیا مسخ جسمانی ہوگیا تھا. جیسا کہ قرآن کی ظاہر عبارت سے مترشح ہوتا ہے، اور عموماً اہل تفسیر نے اسی پہلو کو اختیار کیا ہے، یا مسخ ذہنی و اخلاقی حدود تک رہا تھا؟ جیسا کہ مجاہد تابعی کا قول شروع سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے. سو اس کے جواب میں قرآن کے متعلم کو زیادہ کرید کی حاجت ہی نہیں. قرآن، واقعہ کے نفس وقوع کی خبر پہلی بار، اپنی ذمہ داری پر نہیں دے رہا ہے. صرف ایک مسلم و متعارف واقعہ کی یاد دہانی مخاطبین کو کر رہا ہے. مجرم سے اشارہ اس کے ایک پچھلے اور

اقبالِ جرم کی جانب کر رہا ہے۔ عنوانِ بیان ملاحظہ ہو لقد علمتم۔ علمتم۔ خود ہی کافی تھا یعنی تم تو علم رکھتے ہو۔ واقعہ تمہارا جانا بوجھا ہوا ہے کوئی سنی سنائی روایت یا افواہ نہیں۔ پھر اس پر تاکید اور وہ بھی دوہری، ل کے ساتھ بھی اور قد کے ساتھ بھی! یعنی وہ واقعہ جس سے تم خوب اچھی طرح واقف ہو اس سے انکار کیا معنی، اس میں شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں —— بس اب اس سے زیادہ تفصیل سے کسی کو بحث کیا؟ وہ جس صورت اور جس کیفیت کے ساتھ بھی پیش آیا ہو، بہر حال تھا تاریخ اسرائیل کا کوئی معلوم و معروف واقعہ۔ اور اسی سے تو قرآن کے معاصرین کو اس پر زبان کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"کفر" سلیمانی کی حقیقت

داؤد نبی کے بعد اب ان کے فرزند جانشین سلیمان نبی کی طرف آیئے۔ سال وفات ۹۲۳ ق م۔ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے، جیسے کسی اہم واقعہ کی خبر دے رہا ہو، کہ

وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا۔ — کفر سلیمان نے تو نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کیا کرتے تھے۔

لیکن یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن تو خود ہی ان کے نبی اور برگزیدہ ہونے کی شہادت بار بار، صاف صاف دے رہا ہے اور اب یہ کہہ رہا

ہے، کہ وہ کافر نہ تھے۔ نبی کو جو کافر سمجھے وہ خود ہی کافر۔ اور بالکل ظاہر ہے کہ جو منصب نبوت سے سرفراز ہوگا، اسے کفر سے نسبت کیا؟ یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ شاہ انگلستان کسی کو ہندوستان کا وایسرائے بنا کر بھیجیں، اور پھر یہ بھی اعلان کرنے لگیں کہ وہ باغیوں اور غداروں میں نہیں!۔۔۔ تو کیا قرآن نے حشو بھی اپنے اندر جائز رکھا ہے؟

اس منزل پر پہنچ کر اس حقیقت کو یاد کر لیجئے کہ قرآن سے قبل دو اور قومیں نبوت کا کلمہ پڑھتی ہوئی اس دنیا میں آباد ہوئی تھیں، اور اس وقت تک آباد تھیں، ایک یہود دوسرے نصرانی۔ ان دونوں نے ایک طرف تو سلیمان بن داؤد کا شمار انبیاء میں کیا۔ ان کے نام کے صحیفہ کو اپنے صحائف آسمانی کے مجموعہ میں جگہ دی۔ اور دوسری طرف ان کی بدکرداری اور فسق کا ڈھول اس زور سے پیٹا، کہ انھیں دائرہ ایمان و حلقہ توحید ہی سے خارج کر دیا اور آج تک خارج کئے ہوئے ہیں یہود کی ایک تازہ مستند کتاب ویلنٹائن کی یک جلدی جیوش انسائیکلوپیڈیا

valentine·s.one.volume.jewish.encyclopedia

میں ہے۔

"سلیمان نے حکمرانی ایک مشرقی فرماں روا کی شان، شوکت سے کی اور انھیں کمزوریوں کے ساتھ بھی۔ یعنی عورتوں سے عشق، عالیشان

عمارتیں اور پر تعیش طرز معاشرت یہی چیزیں آخر تباہی لائیں. پھر پر تعیش زندگی کے لئے ٹیکس بھی بھاری بھاری لگانے پڑے" (صفحہ ۲۱)

دوسری بارہ جلدوں والی ضخیم جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔ اور اسرائیلیوں کے بڑے قدیم مورخ جوزیفس نے تو فسق و فجور ہی کو نہیں، صاف صاف ارتداد، ترک و بت پرستی کو آپ کی جانب منسوب کر دیا ہے،

رہے مسیحی، تو ان کے کلیسا میں مدتوں زور و شور سے بحث اس مسئلہ پر جاری رہی کہ سلیمان کی مغفرت ہو گی یا نہیں؟ اور سینٹ آگسٹائین اور بہت سے آبائے کلیسا نے سوال کا جواب نفی ہی میں دیا! (ملاحظہ ہو ہیسٹنگز کی "ڈکشنری آف دی بائبل" جلد ۴۔ صفحہ ۵۶۶ حاشیہ۔) اور رومن کیتھولک گروہ کی مستند کتاب کیتھولک ڈکشنری میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ (مسلمان ناظرین اس "نقل کفر" کو معاف فرمائیں)

"اس کی عیاشی اور غیر کفو بیویوں کی رضا جوئی نے بت پرستی تک اس کی نوبت پہنچا دی۔ گو بعض کا خیال ہے کہ اسے آخر وقت توبہ نصیب ہو گئی تھی" (صفحہ ۹۱۲)

اور یہ فتوے ان مشائخ یہود و آبائے کلیسا کے کچھ طبع زاد نہ تھے جن نوشتوں کو یہ صحائف آسمانی قرار دیئے ہوئے ہیں۔ ان تک میں

یہ تصریحات موجود ہیں ،۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" "سو از بسکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا" (۱۔ سلاطین ۱۱: ۹ و ۱۰)

"خدا نے اسے تمام اسرائیل کا بادشاہ کیا تو بھی اجنبی عورتوں نے اسے بھی گنہگار کیا" (نحمیاہ ۱۳: ۲۶)

نمونہ کے لئے یہ چند تصریحات کافی ہیں۔ کُل کہاں تک سنئے گا۔ ان کے بعد بھی کیا یہ خیال باقی رہ سکتا ہے، کہ قرآن نے بلا ضرورت خواہ مخواہ ایک بات کہہ ڈالی؟

ضرورت اس صفائی اور تبریہ کی شدید تھی۔ فرد جرم کس ڈھائی اور زور کے ساتھ لگ چکی تھی۔ اور یہ الزامات لگانے والے غیر اور بیگانے نہیں، سلیمان کے اپنے اور یگانے ہی تھے! صفائی بھی اسی قطعیت و زور کے ساتھ پیش ہونی لازمی تھی۔ قرآن کا مقصود اسی اتہام کی تردید تھی ـــــ اور یہ محض ظن و قیاس نہیں۔ تفسیر ابن جریر میں ،

ایک نہیں دو دو روایتیں اس مضمون کی منقول ہیں۔ کہ جب قرآن میں ذکر حضرت سلیمان کا بہ سلسلہ انبیاء آیا، تو اس وقت کے مشائخ یہود نے بہ طور طنز کہا، کہ دیکھو تو سہی محمد نے ایک ساحر کو پیمبر بنا دیا! ـــ اب آیت کے الفاظ دوبارہ پڑھیے۔ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا صدیوں سے جو الزام تم سلیمان پر لگا ہوا سنتے آرہے ہو، یہ سب غلط و خرافات ہے۔ شرک اور بت پرستی الگ رہی، ان سے تو کوئی سفیہ حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ کفریہ اعمال تو شیاطین کے۔ تھے خود ایسی حرکتیں کرتے تھے، اور رکھ دیتے تھے سلیمان پر!۔

پُرزور صفائی

شیاطین، (بہ صیغۂ جمع) سے مراد محاورۂ قرآنی میں شیاطین انس بھی ہوتی ہے۔ یعنی شیطان صفت انسان۔ حضرت کے زمانے میں ان فتنہ پرداز مفسدوں کی کثرت ہوگئی تھی۔ یہ سحر و کہانت کے ماہرین برابر آپ کے خلاف تہمتیں تراشتے رہتے، اور غدر و بغاوت پھیلایا کرتے۔ توریت کے صحیفۂ سلاطین حصہ اول کے دو باب ۱۱ و ۱۲ انھیں کے قصوں سے لبریز ہیں۔ ہمارے مفسرین و متکلمین میں سے بعض کا خیال انھیں کی طرف گیا ہے۔

غرض قرآن نے سلیمان کی صفائی کا اعلان کیا۔ بڑے پُر قوت

دعووں کے مقابلے میں کیا۔ اور دنیا نے، مخالفین، و معاندین کی دنیا نے، قرآن ہی کی آواز کو سنا۔ یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں اہل کتاب کے جو محققین اور "اسکالرز" ہیں، ان کے قلم سے تصدیق و تائید، بائبل کی نہیں قرآن ہی کے بیان کی نکل رہی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے آخری یعنی چودھویں ایڈیشن میں جو مقالہ solomon پر ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں تائید ان کے موحد ہونے کی solomon was a sincere worshipper of jahweh سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔
(جلد ۲۰ صفحہ ۹۵۲)

اور اس سے چند سال قبل خاص بائبل ہی کی انسائیکلوپیڈیا، چار جلدوں میں، بائبل کے محققین اور ماہرین کے قلم سے شائع ہوئی تھی اس میں تو یہاں تک صراحت ملتی ہے، کہ بائبل کی جن عبارتوں میں سلیمان کے کفر و شرک کا ذکر موجود ہے، وہ خود الحاق یا جعلی ہیں! اور اس کے بعد یہ کہ:-

یہ تو غالباً صحیح ہو کہ سلیمان کے حرم متعدد تھے۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن انھوں نے نہ تو عبادت گاہیں ہی سب کے لئے تیار کرائیں۔ اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ

اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش جمع ہونے دی'' انسائیکلوپیڈیا ببلیکا۔ کالم ۴۶۰۹)

اسی طرح ہیسٹنگز کی پانچ ضخیم مجلدات والی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے :۔

''یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ بادشاہ نے خدائے واحد پر سے اپنا ایمان ترک کر کے شرک اختیار کر لیا ہو، البتہ اس شہرت کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں'' (جلد ۴ صفحہ ۵۶۷)

ایک امی کے لائے ہوئے علوم پر علمی دنیا کی ایسی برجستہ گواہیاں بجائے خود ایک معجزہ ہیں!

سحر بابل ''کفر'' سلیمانؑ ہی کے سلسلہ کی ایک چیز یہود کا مشغلہ سحر و کہانت ہے۔ قرآن اپنے معاصر یعنی چھٹی صدی مسیحی کے یہود عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۝ اور پھر چند لفظوں کے بعد وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۝ تشریح دونوں فقروں اور پوری آیت کی یہ ہوئی کہ یہود رسول کی تعلیمات پر تو کان دھرتے نہیں، قرآن کی آواز تو سنتے نہیں۔ یہ پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس سحر کے جو شیاطین عہد سلیمان میں کرتے تھے (اہل لغت نے تصریح کر دی ہے عَلٰى مُلْكِ سلیمان بہ معنی

فی ملک سلیمان کے ہے) اور اس سحر کے بھی پیچھے لگے ہیں جو بابل میں دو فرشتوں پر کسی مصلحت تکوینی سے اتارا گیا تھا۔

قرآن کو مقصود یہاں یہود کی محبت و مناسبت سحر کے ساتھ بیان کرنا تھی لیکن ضمناً یہ بھی کہہ گیا، کہ سحر دو رائج تھے۔ ایک سحر حضرت سلیمانؑ کے ملک والا یعنی سحر فلسطینی، اور دوسرا سحر بابل۔ اور یہود ان دونوں میں سے بند کسی میں نہ تھے۔ اب گویا تین باتیں الگ الگ ہوئیں :۔

ایک یہود کا سحر پیشہ ہونا، سحر پر حریص ہونا۔

دوسرے، سحر کا مرکز فلسطین ہونا۔

تیسرے، سحر کا ایک مرکز بابل ہونا۔

امر اول کی شہادت خود یہود ہی کے صحائف مقدس میں موجود ہے بائیبل کی کتاب سلاطین ۲ میں ہے :۔

اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا۔ اور فال گیری اور جادوگیری کی ..... ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر بہت غصہ ہوا، اور اپنی نظر سے گرا کر دور کر دیا۔"

(۱۷:۱۷، ۱۸)

اور صحیفہ میکاہ Micah میں اسرائیلیوں کے مبارک ایام اقبال کی پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں ہے :۔

تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں پر بلند کیا جائے گا اور تیرے سارے مخالف نیست ہو جائیں گے۔ اور اسی دن میں یوں ہو گا خداوند فرماتا ہے، کہ ..... میں تیرے ہاتھ کی جادوگریاں منقطع کروں گا اور تیرے یہاں ساحر پھر نہ ہوں گے" (۵: ۱۰ و ۱۲)

یہ صرف دو حوالے پیش کئے گئے، ورنہ یہود کی ساحری، جادوگری فال گیری وغیرہ کے تذکروں سے تو ان کے صحائف مقدسہ کے ورق کے ورق رنگین ہیں۔ ان کے ہاں کے جدید مستند ترین مخزنِ معلومات، جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے :-

"جادوگری سارے قدیم بنی اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھی .... سحر کا علم عدالت العالیہ کا رکن بننے کے لئے لازمی تھا۔ بڑے سے بڑے علماء سفلیات کے ماہر ہوتے تھے .... اور عوام تو جادوگری پر فدا تھے" (جلد ۸۔ صـ ۲۵۵)

یہ ذکر آغاز اسلام سے بہت قبل کا ہے۔ بعد آغاز اسلام یعنی نزول قرآن کا ماجرا، محب اسلام نہیں، دشمن اسلام اور یہودی النسل، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر، مارگولیس کی زبان سے سنئے :-

وہ لوگ (یعنی یہود عرب) سحر کے ماہر تھے، اور بہ مقابلہ کھلم کھلا قتال کے سفلی عملیات کو زیادہ پسند کرتے تھے" (سیرۃ نبوی

(کتاب محمد۔ صفحہ ۱۹۹)

فلسطینی سحر تو انہیں آبائی ورثہ میں ملا تھا، رہا سحر بابل، سو وہ ان شوقینوں نے اپنے شوق سے سیکھ لیا تھا۔ بابل سے مراد وہ ملک ہے جو آج عراق کہلاتا ہے، اور کسی زمانے میں کلدانیہ کہلاتا تھا۔ انگریزی میں اسی کو کالڈیا کہتے ہیں۔ اس کے جو مذہبی کتبے آج برآمد ہوئے ہیں وہ تمام تر سحریات، سفلیات، عملیات سے بھرے ہیں۔ اس کا سحر ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان میں کلدانی chaldean مرادف ہوگیا ہے ساحر کے۔ اور محاورہ میں اس فقرہ He is a chaldean کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ساحر ہے۔ بابل جب تباہ ہوا تو اس کے باشندے ادھر ادھر منتشر و متفرق ہوگئے۔ جہاں جہاں گئے، قدرۃً اپنے علوم سحر و کہانت کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہود پہلے ہی سے اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بڑھ کر اہل بابل کا استقبال کیا۔ اور بہترین شاگرد ان استادوں کے ثابت ہوئے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"یہود نے ہر حصہ ارض میں بابل کا ادب و احترام جاری رکھا"

(جلد ۲۔ صفحہ ۴۳۲)

ہاروت و ماروت

ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے سے، اور
ان پر سحر نازل ہونے سے، طبیعت کو وحشت
بالکل نہ ہو۔ جب کسی قوم میں سحر و کہانت کا شمار علوم عالیہ میں ہونے
لگے، سحر و کہانت اور نبوت و رسالت کے درمیان التباس ہونے لگے
اور لوگ نبی کی نبوت سے انکار کرکے اسے بے تکلف ساحر قرار دینے
لگیں، تو اس صورت حال میں یہ بات دل کو بالکل لگتی ہوئی ہے کہ قوم
کو اس باب راہ ہدایت دکھانے اور سحر و نبوت کے درمیان فرق
سمجھانے کے لئے جنس انبیاء سے علاوہ کوئی اور مخلوق بھیجی جائے۔
دو فرشتے انسانی لباس میں، اس غرض سے اس مرکز سحر اور مستقر کہانت
میں بھیجے گئے۔ لوگ ان کے پاس آتے۔ یہ انہیں رائج الوقت کفریات
سے روکتے، منع کرتے، سمجھاتے بجھاتے۔ اب ان میں جو بدفطرت ہوتے
وہ اس قسم کے سوالات کرید کرید کر کرتے، کہ سحر کہتے کسے ہیں۔ عملیات
سحری ہوتے کیا کیا ہیں، کن کن اغراض کے لئے ہوتے ہیں، ذرا انہیں
تفصیل سے بیان کیجئے، جب تو ہم سمجھیں ——— فقہ کی کتابوں سے معاصی
و جرائم کے، اور طب کے رسالوں سے بدچلنی کے سبق ڈھونڈ ڈھونڈ نکالنے
والے کیا آج بھی کثرت سے موجود نہیں؟ ——— تو غرض یہ کہ ان حیلوں
تدبیروں اور چالاکیوں سے یہ فرشتوں کی زبان سے بھی جرائم و معاصی کی

تعلیم حاصل کر لیتے! اور فرشتے بیچارے اپنی زبان سے یہ کہتے ہی رہ جاتے، کہ ہم تو ذریعہ آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں (نَحْنُ فِتْنَةٌ) کہیں ہم سے الٹی تعلیم بدی و بدکرداری کی نہ حاصل کرنے لگنا (فَلَا تَكْفُرْ)

خیال نہ گزرے کہ سحر جیسی گندی چیز کے لئے لفظ، نزول وانزال کیسا (وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ) اس سے تو فی الجملہ عظمت ہی نکل رہی ہے سحر کی! ـــــ وہم بے بنیاد ہے۔ نزول تکوینی کے سلسلہ میں تو یہ لفظ بیماری، موت، قحط، خشک سالی، یہاں تک کہ عذاب و بلا سب کے لئے عام ہے۔ اور محاورۂ قرآنی میں اس کا استعمال روزی (رزق) اور پوشاک (لباس) کے لئے بھی ہوا ہے۔ اور پانی (ما)، لوہا (حدید) اور چوپائے (انعام) کے لئے بھی ـــــ اور جرائم سے گہری واقفیت تو بعض اوقات خود مجرم سے بڑھ کر پولیس اور مجسٹریٹ کو ہوتی ہے۔ اور مرض کے شدائد سے واقفیت مریض سے بڑھ کر طبیب کو۔

بنی اسرائیل اور قتل انبیاء

قرآن کی عدالت میں بنی اسرائیل مجرموں کے کٹھرے میں کھڑے ہیں اور ایک طویل فرد جرم انھیں سنائی جا رہی ہے۔ اس میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ اس قوم نے اپنے انبیاء کے ساتھ جبر اور بدسلوکیاں جو

کیں وہ تو کیں ہی، باقی بعض اوقات انھیں قتل تک کر ڈالا ہے!
الزام ہے یقیناً سنگین اور قومی ضمیر کو تھرا دینے والا۔ لیکن ساتھ
ہی اتنا جچا تلا، کہ تاریخ کی زبان کو انکار پر کھلنے کی گنجایش ہی نہیں
قتل اشعیاہ Isaiah نبی کا، قتل یرمیاہ jremial نبی کا قتل
ذکریا zacharias نبی کا، قتل یحییٰ john نبی کا سب سے آخر
میں اقدام قتل عیسیٰ مسیح کا۔ یہ چند عنوانات جلی ہیں۔ اسرائیل کی
تاریخ سفاکی و بہیمیت کے!
شہادت خود انھیں کے صحائف مقدس کی سنئے:۔

"وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے! اور انھوں نے تیری
شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا۔ اور تیرے نبیوں کو جو
ان کو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرا لائیں،
قتل کیا، اور انھوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصہ دلایا"
(نحمیاہ ۹: ۲۶)

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کے مانند تمھارے
نبیوں کو کھا گئی ہے" (یرمیاہ ۲: ۳۰)

"اور خداوند ان کے باپ دادوں کے خدا نے اپنے رسولوں
کی معرفت سے ان کے پاس پیغام بھیجا لیکن انھوں نے خدا

کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑا، اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خداوند عالم کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔"

(۲۔ تواریخ۔ ۳۶: ۱۵ و ۱۶)

انجیلوں میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے صراحتیں اس سے بڑھ کر موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو انجیل متی۔ ۲۳: ۳۱ و ۲۷۔ نیز انجیل لوقا۔ ۱۳: ۳۴)

شہادتِ یحییٰؑ حضرت یحییٰؑ اس قوم کے آخری نبی (بجز حضرت عیسیٰؑ کے) تھے۔ عہد قبل تاریخ کی تاریکیوں میں نہیں، تاریخ کی روشنی کے زمانے میں تھے۔ بادشاہ وقت ہیرودؔ نے شریعت وقت کے خلاف اپنی حسین بیوہ بھاوج کو اپنی ملکہ بنا لیا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے آکر اس اقدام پر نصیحت اور ملامت کی۔ ملامت بادشاہ سے زیادہ ملکہ کو ناگوار گزری۔ ناصح جیل بھجوائے گئے۔ بادشاہ کی سالگرہ کا دن آیا۔ بادشاہ دل میں انھیں بے قصور سمجھ ہی رہا تھا۔ ارادہ کیا کہ آج جشن کی خوشی میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی رہا کر دوں گا۔ بزم نشاط میں بیٹھا، تو اتفاق سے شراب معمول سے زیادہ پی لی۔ نشہ تیز ہو گیا۔ سامنے اسی ملکہ کی لڑکی

پہلے شوہر سے۔ ناز و ادا، حسن و جمال کی پتلی، رقص کو کھڑی ہوئی مخمور بادشاہ بے خود ہو کر بولا "مانگ کیا انعام مانگتی ہے۔ آدھی سلطنت دیدینے کو تیار ہوں"۔ لڑکی سکھائی پڑھائی ہوئی تھی۔ ماں کے اشارہ سے بولی "مجھے تو یحییٰ کا سر چاندی کے طشت میں چاہیئے"۔ بادشاہ کا نشہ ہرن ہوا۔ بولا "ارے آج جشن مسرت کے دن اپنا ہاتھ خون سے رنگوں"؟ سفاک رقاصہ نے ٹھنک کر کہا "لونگی تو وہی سر لونگی"! بادشاہ نے حکم دیدیا۔ اور دم کے دم میں خدا کے اس نبی اور قوم اسرائیل کے تقریباً آخری پیمبر کا سر مبارک جیل سے کٹا ہوا، اور چاندی کے طشت میں لگا ہوا، آگیا، ملاحظہ ہو انجیل مرقس، باب ۶ کی آیات ۱۷ تا ۲۸۔ اور انجیل متی کے باب ۱۴ کی آیات ۳ تا ۱۱۔ نیز مشہور و قدیم یہودی مورخ جوزیفس کی تاریخ "آثار قدیمۂ یہود Antiquities of the jews کے باب ۱۸ کی فصل پنجم۔ اور جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷، ص ۲۶۹

خونِ ناحق

ابھی گزر چکا ہے کہ قرآن نے اسرائیلیوں کے ہاتھوں انبیاء کے قتل ناحق کا ذکر کیا ہے۔ قتل تو خیر، لیکن اس کے ساتھ یہ "ناحق" (بغیرِ الحق) کی قید کیسی۔ قتل انبیاء تو ظاہر ہے کہ جب کبھی بھی ہوگا۔ ناحق ہی ہوگا۔ حق ہو ہی

کب سکتا ہے پھر کیا یہ لفظ حشو ہے؟ ــــ قرآن جیسے بلیغ اور حکیمانہ کلام میں حشو کیسا
جواب یہ ہے کہ حشو نہیں. مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ قتل انبیاء بجائے خود
اور عنداللہ تو ہمیشہ ہی ناحق ہو گا، لیکن بدبخت قاتلوں نے جب جب اپنے
ہاتھ ان معصوموں کے خون سے رنگین کیئے، وہ قتل ایسے تھے کہ خود انھیں
کے معیار سے، ان کے معیار معدلت وضابطہ وقانون سے بھی ناحق تھے. ہمارے
بعض نکتہ سنج مفسرین اس نکتہ تک از خود پہنچ گئے. اور بغیر قدیم قوموں کی
تاریخوں کا مطالعہ کیئے ہوئے خود ہی لکھ گئے بِغَيْرِ الْحَقِّ اے كَانَ ذٰلِكَ
عِنْدَهُمْ اَيْضًا بِغَيْرِ الْحَقِّ یعنی انصاف خداوندی کے خلاف تو تھا ہی،
عدالتوں کا جو ضابطہ اور فوجداری کا جو قانون ان کے ملک وقوم میں جاری
تھا اس کے بھی خلاف تھا.

مسیح عدالت میں قرآن نے یہ بات ضمناً اور محض ایک دوسرے
بیان کی بیٹ میں ساڑھے تیرہ سو برس قبل
کہہ ڈالی تھی. اب کچھ عرصہ ہوا، یورپ کے ماہرین قانون نے قدیم
نوشتوں کی مدد سے حضرت مسیح کے مقدمہ کی روداد از سرنو مرتب کی ہے
اور ایک کتاب انگلستان کے بیرسٹر اینس Innes نامی نے Trial of
Jesus Christ کے نام سے، اور دوسری، اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ
روزیڈی Rosadi نے Trial of Jesus کے عنوان سے شائع کی،

دونوں کتابوں کے مطالعہ سے صاف نظر آجاتا ہے کہ حضرتؑ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے کوئی اجتہادی غلطی سرزد ہوگئی بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک جھوٹا استغاثہ گڑھا۔ اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں بے ضابطہ کارروائیاں کر کراکے اور پھر ملک کی فوجداری عدالت میں رومی حاکم پر طرح طرح کے زور دباؤ ڈال کر سولی کا حکم دلانے میں کامیاب ہوگئے! — یہ اندھیر جب رومیوں کے روشن اور تاریخی عہد حکومت میں، رومی جیسی آئین دوست و قانون سرشت حکومت کی عدالت میں ممکن ہوگیا، تو قدیم تر انبیاء کی مظلومیت اور اس عہد قبل تاریخ کی تاریکیوں اور ضابطہ شکنیوں کا کیا ٹھکانا! اب جاکر کچھ قدر ہوئی قرآن کے اس چھوٹے سے دو لفظی فقرہ بِغَيْرِ الْحَقِّ کی!

انجام مسیحؑ حضرت مسیحؑ کے مقدمہ تک تو آپ پہنچ ہی گئے، اب ایک نظر دنیا میں ان کے انجام پر بھی کرتے چلیئے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ ہمارے درمیان یسوع ناصری نامے (نعوذ باللہ) ایک شعبدہ باز اور مفسدہ پرداز، انبیائے سابق اور شریعت موسوی کی توہین کرنے والا پیدا ہوا تھا، سو ہم نے اس کا کام تمام کردیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ خدا دنیا کے گنہگاروں پر رحم کرنا چاہتا تھا، لیکن سب کو یک لخت معاف کردینا اس کے قانون عدل کے منافی تھا، اس لئے وہ خود یا اُسکا اکلوتا بیٹا،

انسان کے قالب میں اور یسوع نام رکھ کر ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے کو نوع انسانی کے کفارہ کے طور پر پیش کر دیا۔ اس نے انسانی قاعدہ کے مطابق سولی پر چڑھ کر جان دی۔ اور وہ تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر چلا گیا —— گویا حضرتؑ کی نفس موت پر غالی دشمن اور غالی دوست دونوں متفق ہیں۔ اور اب ایک عرصہ سے قادیان کا جدید فرقہ بھی انہیں کا ہمنوا ہو گیا ہے

قرآن نے بے جگری کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کے مسلمات کو چیلنج دیدیا اور علانیہ کہدیا وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ۔ کہ یہود آپ کو نہ تو ہلاک کر سکے، اور نہ سولی ہی پر چڑھا سکے۔ بلکہ خود ہی دھوکے میں پڑ گئے، انہیں پر حقیقت مشتبہ ہو گئی! دوسرے لفظوں میں یوں کہئے، کہ دشمنوں نے آپؑ کی جان لینا چاہی، بلکہ اپنے خیال میں لے ڈالی بھی لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہوا، دشمن خود وہم و التباس کا شکار ہو گیا —— لیکن ایسی صورت ممکن کیونکر ہوئی؟ تاریخی قرائن، قیاسات شواہد اپنا فیصلہ کیا سناتے ہیں؟

حضرت مسیح کا زمانہ، قبل تاریخ کا زمانہ ہے۔ آپ کا ملک، آپ ہی کے ہم قوم یہودیا اسرائیلیوں کا ملک تھا، جیسے ہندستان ہندوستانیوں کا ہے۔ صوبہ یہودیہ Judea یا ارض شام کا علاقہ تھا۔ اس پر حکومت اصلی یہود کی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ کی مشہور و مہذب رومی قوم کی تھی۔ جیسے ہندستان

پر آج حکومت برطانوی قوم کی ہے۔ اور یہودیہ اسی طرح ایک حصہ رومن ایمپائر کا تھا، جیسے آج ہندوستان ایک حصہ برٹش ایمپائر کا ہے۔ لیکن اس اقتدار اعلیٰ کے ماتحت نیم سیاسی آزادی اور مذہبی حیثیت سے تقریباً پوری آزادی یہودیہ کو حاصل تھی۔ تقریباً ایسی ہی جیسے آج برطانیہ کے زیر سیادت مصر کو حاصل ہے۔ یہودیہ کا نیم خود مختار فرماں روا اس وقت مشہور زبردست جابر ہیروڈ تھا۔ حضرت یحییٰ کا سر چند سال قبل اسی کے حکم سے قلم ہو چکا تھا۔ ملک کی فوجداری اور دیوانی عدالتیں۔ نیز فوج اور پولیس کے محکمے رومی حکومت کے ماتحت تھے۔ یہودی رعایا کے مقدمے پہلے خود آبائے یہود و مشائخ بنی اسرائیل کی مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے فیصلے وہیں سے صادر ہوتے تھے۔ لیکن جرم اگر فوجداری کا ہوتا تو سزا کے نفاذ کے لئے مقدمہ دوبارہ ملکی عدالت میں پیش ہوتا، اور فیصلہ نافذ وہیں کا ہوتا۔ سنہ غالباً ۲۹ء مسیحی تھا۔ جب مشائخ یہود کے حکم سے یسوع ناصری نامی "مجرم" کی گرفتاری عمل میں آئی۔ روایات سب اس پر متفق ہیں کہ آپ کو پہلے یہود کی مذہبی عدالت سے سزا "ارتداد" کے جرم میں موت کی ملی۔ اور پھر ملکی عدالت میں رومی حاکم نے بھی بغاوت کی دفعہ میں حکم سولی کا دیا۔ لیکن اس کے آگے یہ امر محقق و مسلم نہیں، کہ سولی پر چڑھائے

لہ سنہ تحریر سنہ ۱۹۳۲ء

بھی آپ ہی گئے۔ بلکہ قومی تشبہات سب اس کے برعکس ہیں۔

زبان و مکان کی تعیین ہو چکی۔ اب صورت حال کو پوری طرح پر سمجھنے کے لیے ماحول کے خصوصیات ذیل کو نگاہ میں رکھیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک میں آبادی یہود کی تھی، اور پولیس عدالت فوج رومیوں کی۔ رومی مشرک بت پرست تھے، یہود توحید و نبوت کے قائل۔ رومیوں کی زبان لاطینی تھی، یہود کی بولی چال کی زبان سریانی تھی اور کتابی زبان عبرانی۔ رومی یوروپی نسل کے تھے، اور یہود سیماطیقی یا سامی نسل کے۔ غرض یہ کہ مذہب، زبان، لباس، وضع، تمدن، معاشرت، صورت ہر چیز میں یہود رومیوں سے الگ اور ممتاز تھے جیسے ہندوستانی انگریزوں سے تھے۔ اور اس کا نتیجہ قدرۃً یہ تھا کہ ایک رومی کے پہچاننے میں یہود کو ایسی ہی دقت پیش آتی تھی، جیسے ہندوستانیوں کو گوروں کے پہچاننے میں، اور گوروں کو کالوں کے شناخت کرنے میں، ہندیوں کی نظر میں سب فرنگی یکساں، فرنگیوں کی نظر میں سب ہندی ہم شکل ٹھیک اسی طرح رومیوں کی نظر میں کل یہود یکساں دکھائی دیتے تھے

اور یہ معلوم ہے کہ رومی عدالت کے چپراسی، پیادے، پولیس گارڈ اور رومی جیل کے برقنداز (وارڈر) عموماً رومی ہی ہوتے تھے، ان سے یہ توقع رکھنا بالکل بیجا تھی کہ وہ کسی معمولی مجرم کی خاص طور پر

شناخت رکھیں گے۔ حضرت مسیحؑ پیغمبر خدا یا "ابن اللہ" کی اہمیت اب دنیا کی نظر میں جو کچھ بھی ہو۔ اس وقت رومی حاکم اور رومی سپاہیوں کی نگاہ میں یسوع ناصری نامی ایک شخص کی حیثیت بجز بغاوت کے ایک عام دمعمولی مجرم کے اور کیا تھی؟ تھوڑی بہت جو کچھ بھی مخالفانہ حیثیت سے تھی، وہ یہود کی نظر میں تھی۔ رومیوں کی نگاہ میں تو اتنی بھی نہ تھی۔

ان عام حالات کے ساتھ یہ خاص حقیقت بھی پیش نظر رکھئے کہ حضرت کو لوگوں کی نظر بلکہ اپنے ہی ہم قوم دشمنوں اور مخالفوں کی نظر بچا کر نکل جانے میں خاص کمال تھا۔ مسیحی اسے آپ کے معجزات میں شمار کرتے ہیں، یہود اسے (نعوذ باللہ) آپ کی شعبدہ بازی پر محمول کرتے ہیں بہر حال نفس واقعہ سب کو تسلیم ہے (ممکن ہے اس کا ایک ظاہری سبب آپ کی گوشہ گیری اور خلقت سے کم آمیزی بھی ہو) اناجیل میں آپ کی اس خصوصیت کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ ناصرہ میں ایک وعظ کے بعد کا منظر، حسب روایت لوقا، ذرا غور سے ملاحظہ ہو۔

"جتنے عبادت خانے کے اندر تھے اِن باتوں کے سنتے ہی غصہ میں بھر گئے۔ اور اٹھکر اس کو شہر سے باہر نکالا، اور اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس پر ان کا شہر آباد تھا، تاکہ اسے سر کے بل

گرا دیں۔ مگر وہ ان کے بیچ سے نکل کر چلا گیا۔" (لوقا ۴: ۲۸۔۳۰)

خاص یروشلم میں بھی ایک بار یہود نے مشتعل ہو کر آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اور ناکام رہے۔

"انھوں نے پھر اس کے پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔" (یوحنا ۱۰: ۳۹)

اسی انجیل میں ایک دوسرے موقع کا بیان سنیئے۔

"یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا، میں ہوں۔ پس انھوں نے اس کے مارنے کو پتھر اٹھائے۔ مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا۔ (یوحنا ۸: ۵۹)

یہ سب منظر تو دشمنوں کے مقابلہ میں پیش آئے۔ کبھی کبھی مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بھی آپ کی ہیئت بدل جاتی تھی۔

"یسوع نے پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں الگ ایک اونچے پہاڑ پر اکیلے میں لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔" (مرقس ۹: ۲)

انجیل لوقا میں ہے:

"جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی، اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔ (لوقا ۹: ۲۹)

اور انجیل متی میں ہے :۔

"ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی، اور اس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا اور اس کی پوشاک نور کے مانند سفید ہو گئی" (متی ۱۷: ۲)

آخری اور انتہائی بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ جب واقعۃً آپ کی گرفتاری گستمنے کے باغ میں ہوئی ہے، تو اگرچہ گرفتار کرنے والے پوری بھیڑ کی بھیڑ تھے۔ تاہم اس بھیڑ کو بھی اطمینان نہ تھا کہ آپ کو پہچان سکے گی۔ چنانچہ شناخت کے لئے آپ کے بارہ حواریوں میں سے ایک غدار حواری یہوداہ نامے کو توڑ لیا۔ اس جزو پر ساری انجیلیں متفق ہیں۔ متی میں ہے :۔

"یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا آیا۔ اور اس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آپہنچی اور اس کے پکڑوانے والے نے انہیں یہ بتا دیا کہ جس کا میں بوسہ لوں، وہی ہے اسے پکڑ لینا" (متی ۲۶: ۴۷، ۴۸)

مرقس کی روایت بھی تقریباً بالکل انہیں الفاظ میں ہے

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھنے کے بعد ایک کڑی یہ لا لیے کہ رومیوں کا جو سولی گھر تھا، وہ عدالت سے اچھے خاصے فاصلے پر

تھا۔ انجیلوں میں اس مقام کا نام لاطینی تلفظ کے مطابق کیلوری calvary اور عبرانی تلفظ کے لحاظ سے golgotha گلگتا آتا ہے۔ اور اردو میں اس کا ترجمہ کھوپری یا کھوپڑی کی جگہ کیا گیا ہے۔ اس جگہ کا تعین صحت کے ساتھ تو دشوار ہے۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ مقام تھا شہر سے دور، شہر پناہ کے باہر۔ انجیل ہی کے ایک صحیفہ "عبرانیوں کے نام کا خط" میں ہے (۱۳ : ۱۲) کہ یسوع نے بھی اُمت کو اپنے خون سے پاک کرنے کے لئے "دروازہ کے باہر[لہ]" دکھ اٹھایا غرض عدالت سے وہاں تک فاصلہ حضرت مسیح کو رومی پولیس گارڈ کی نگرانی میں پیدل طے کرنا تھا۔ اور اتنا ہی نہیں سولی کی ایک وزنی لکڑی آپ کو خود اٹھا کر لے چلنی تھی۔ صلیب یا سولی کی شکل تو آپ کے ذہن میں ہوئے ہی گی  ایک ستون تو زمین میں گڑا ہوا ہوتا تھا۔ باقی دوسری لکڑی جو اس کے اوپر آڑی جمائی جاتی تھی۔ اور اسی پر مجرم کے دونوں ہاتھ پھیلا کر کس دیئے جاتے تھے اور ان میں کیلیں ٹھونک دی جاتی تھیں، وہ وہاں لگی ہوئی نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ عدالت میں رہا کرتی تھی۔ اور حکم سزائے موت سننے کے بعد اسے مجرم کو اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک چلنا پڑتا تھا۔

لہ بعض نسخوں میں ہے کہ "پھاٹک کے باہر ہو کر"۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونے دیجیے کہ حکومت کو آپ سے مطلق پرخاش نہ تھی، بلکہ حاکم عدالت تو آپ کو بے قصور پاکر چھوڑ دینے ہی پر تلا ہوا تھا، اور آپ کو سزا جو دی وہ محض یہود سے بلوہ کے خوف سے۔ انجیل متی میں ہے۔

جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا۔ بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔" (متی۔ ۲۷: ۲۴ و ۲۵)

غرض یہ کہ حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے آپ کی کسی خاص نگرانی کا کوئی محل نہ تھا، اور نہ حکومت کو اس کی کوئی خاص فکر تھی کہ آپ بچ کر نکلنے نہ پائیں۔ اور ہاں یہ ضروری جزئیہ بھی یاد رہے کہ جب حکم سنایا گیا ہے۔ تو جمعہ کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت یعنی سبت (یہود کے مقدس دن۔ سنیچر کی) شب عنقریب شروع ہونے والی تھی۔ اور مزید یہ کہ کل صبح عید یہود تھی[۱] شام اگر کہیں راہ ہی میں ہو گئی، تو پھر کچھ کارروائی نہ ہو سکے گی۔

---

[۱] اس جشن کا اصطلاحی نام passover یا عید "فسح" ہے۔

اب صورت حال کو ایک بار پھر نظر کے سامنے لائیے۔ حضرت مسیحؑ لاغر و ناتواں، قاعدۂ مقررہ کے مطابق پشت مبارک پر بوجھل صلیب کو اٹھا کر سولی گھر روانہ ہوئے ہیں۔ وقت کم، فاصلہ زیادہ۔ ساتھ میں رومی سپاہی تو وہی گنتی کے چند تھے، البتہ خود حضرتؑ ہی کے ہم قوم، ہم وضع ہم لباس یہود، انبوہ در انبوہ ساتھ تھے، آپ کو ستاتے ہوئے، چھیڑتے ہوئے، آپ پر آوازے کستے ہوئے۔ صورت حال کا یہ نقشہ ذہن کے سامنے لاکر اپنے ہی سے سوال کیجیے کہ اب کیا ہوا ہوگا؟ رومی سپاہی اپنی قومی برتری کے نشہ میں مست، خود تو یہ کرنے سے رہے کہ اپنی رعایا اور پھر مجرم رعایا کا اٹھانے والا بوجھ خود اپنے سر یا پشت پر لاد لیں۔ پھر ہجوم کی کثرت سے تنگ الگ ہو رہے تھے، اور دیر خواہ مخواہ ہو رہی تھی۔ قدرۃً یہی کیا ہوگا کہ اسی ہجوم میں سے کسی شخص کو پکڑا اور عجب نہیں کہ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر کے، صلیب اسی پر لاد دی ہو۔ اور یہ شخص یقیناً ایسا ہوگا جو حضرتؑ کے قریب آکر بار بار چھیڑ چھاڑ کر رہا ہو اور کچھ ہم شکل بھی ہو تو بعید نہیں، کیا عجب نہیں، واقعۃً ایک شخص کو پکڑا صلیب اس پر لاد دی۔ انجیل متی میں ہے:۔

انھیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔" (متی ۲۷ = ۳۲)

انگریزی میں اسی شمعون کرینی کو Simon the Cyrenian کہتے ہیں۔ دوسری روایت مرقس کی سنیے:۔

"اور شمعون نام ایک کرینی آدمی سکندر اور روفس کا باپ ہات سے آتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ انھوں نے اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے" (مرقس۔ ۱۵: ۲۱)

لوقا کا بیان اور زیادہ صریح ہے:۔

"اور جب اس کو لئے جاتے تھے تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی جو دہات سے آتا تھا، پکڑ کے صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے لے چلے" (لوقا۔ ۲۳: ۲۶)

روایتیں بیان ہو چکیں۔ اب ایک بار پھر چشم تصور سے کام لیجئے! مجرم کا یہ ہم قوم و ہم وضع صلیب پیٹھ پر لادے سولی گھر کے دروازہ پر پہنچا پہرہ بدلا گیا۔ اب چارج جیل کے رومی سنتریوں اور پہرہ داروں کا شروع ہوا۔ وہ یقیناً اسی کو مجرم سمجھے۔ اور نہ سمجھنے کی وجہ کیا تھی۔ صلیب کی لکڑی مجرم ہی کی پیٹھ پر لدی ہوئی تھی۔ ہمیشہ سے اسی علامت کے عادی تھے۔ عدالت کے رومی سپاہی اپنا بیگار ان پر ٹال جیل والوں کا کام خود جیل والوں پر ڈال، معاً رخصت ہو گئے۔ انھیں کیا پڑی تھی شناخت و تحقیق کی مزید زحمت میں اپنے کو مبتلا رکھتے۔ شام ہو رہی تھی جیل کے

سنتری پولی نے جھٹ پٹ اسی کو سولی پر چڑھا دیا ـــ یسوع ناصری یوں بھی دشمنوں کے پنجے سے بار بار نکل چکے تھے، اور اب کی تو تائیدی اسباب بھی اس کثرت سے ان کے حق میں جمع ہو گئے تھے ـــ غرض وہ پکڑا دھکڑا ہوا یہودی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ چیخا چلایا، جیل کے رومی افسر اور سنتری اس کی زبان سے ناواقف۔ قدرۃً یہی سمجھے کہ مجرم کے آخری وقت کا جزع و فزع ہے۔ اور پھر ہزاروں کے ہجوم و ہنگامہ میں اس کی آواز خود یہودیوں سے کتنوں کے کان میں پڑی ہو گی اور کتنوں نے ادھر توجہ کی ہو گی! یہود دھوکے میں پڑے رہ گئے! وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو کر طلسم بن کر رہ گئی!

قدیم نصرانیوں کی گواہی

گمان نہ گزرے کہ خیال تمامتر نیا، اور نظریہ یکسر نو آفریدہ ہے۔ مسیحیوں کے نہیں، نصرانیوں کے قدیم فرقوں میں ایک فرقہ Basilias (بسیلیہ) کا گزرا ہے، کوئی دوسری صدی مسیحی کے شروع میں (اس کے بانی کا زمانہ تقریباً ۱۲۵ء مانا گیا ہے) ان کے ہاں اس عقیدہ کی تصریح موجود تھی کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی! (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۳ صفحہ ۱۰۶) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ایک قدیم فرقہ کا عقیدہ یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ

"غلطی سے مصلوب شمون کرینی ہوگیا۔ اور حضرت مسیحؑ اس کی شکل اختیار کئے ہوئے پاس ہی کھڑے ہوئے ہنستے رہے۔"

(جلد ۲۔ صفحہ ۳۳۰)

آج کی مسیحیت کی ساری زندگی ہی حضرت مسیح کی مصلوبیت اور صلیب پر وفات اور دوبارہ جی اٹھنے کے عقیدہ سے ہے! البتہ ہے لیکن قدیم نصرانیت، ابتدائی صدیوں والی، صاف لفظوں میں قائل تھی، وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی!

عالمگیر دعوت

قرآن بیان کرتا ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اسلام سے قبل جتنے بھی پیمبر آئے۔ سب اپنی یا دوسری کسی ایک ہی قوم کی جانب، اپنے یا دوسرے کسی ایک ہی ملک کے لئے۔ بائبل میں بھی ذکر صرف اسرائیلی انبیاء کا آتا ہے جو قوم اسرائیل کے لئے آئے، یا پھر ان چند انبیاء کا جو اس قوم کے اسلاف اور مورثوں یا عزیزوں میں تھے۔ حضرت ہودؑ صرف قوم عاد کے لئے تھے۔ ہندوستان سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت یونس نینوا والوں کے لئے تھے، چین سے انہیں علاقہ نہ تھا۔ حضرت مسیحؑ کا حلقۂ اصلاح یہود تک محدود تھا، چین اور پارسی، بودھ اور ہندو مذہب ان کے قلمرو سے باہر تھے۔ اسلام نے رہبر عالم کے پیکر میں آکر اس قاعدۂ عام کو

توڑ دیا۔ اور قرآن نے آکر صاف صاف دعوی کر دیا کہ میرا پیام کل دنیائے انسانیت کے لئے ہے، میری مخاطب ساری نسل آدم ہے۔ لیکن اسلام۔ تو خود مدعی انبیاء قدیم کی سنت پر چلنے اور قائم رہنے کا ہے، پھر اس اہم ترین باب میں، خود دائرہ دعوت کے باب میں، یہ جدت، یہ ندرت، یہ بدعت کیسی؟ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کی بھی دعوت مخصوص رہتی، اہل حجاز یا زیادہ سے زیادہ اہل عرب کے ساتھ اور اس کا پیام محدود رہتا نسل اسمٰعیل کے لئے،

مسئلہ کے سمجھنے کے لئے ایک اجمالی نظر دنیائے قدیم کے نقشہ پر کر جائیے ہر ملک دوسرے ملک سے کٹا ہوا، ہر قوم دوسری قوم سے بچھڑی ہوئی ہر سرزمین اپنے مخصوص جغرافی و طبعی حدود کے اندر سمٹی ہوئی، سکڑی ہوئی۔ پہاڑ ہیں تو ناقابل گزر، دریا ہیں تو ناقابل عبور، ندی، نالوں کو پار کرنا دشوار، بلکہ برسات کے موسم میں تو کہنا چاہیئے کہ محال اور بحر، بحیرہ یا سمندر کا تو خیر نام ہی نہ لیجئے، کوئی ایسا ہی شدید سبب دشمنی کا اور قوی محرک فوج کشی کا پیدا ہو گیا، جب تو خیر، ورنہ ہر خطہ زمین کی جو قدرتی چار دیواری بن گئی، بس وہ قوم اسی کے اندر محصور اور گویا نظر بند، مسافرول

له بلکہ اس وقت کی بعض ترقی یافتہ قوموں نے تو اس علیحدگی اور کنارہ کشی میں غلو و مبالغہ سے کام لے کر اپنے افراد کے لئے باہر کا سمندری سفر حرام کر دیا تھا، مثلاً اہل ہند نے۔

کا آنا جانا تو الگ رہا، باہر سے خبروں تک کے آنے کا انتظام نہیں، اور ڈاک کا موجودہ مفہوم تو گویا کسی کے ذہن ہی میں نہیں۔ مہینوں میں کوئی باہمت قافلہ، برسوں میں کوئی جہاں دیدہ سیاح آنکلتا، تو ایک نعمت ہاتھ آجاتی، اور تھوڑی بہت خبریں آس پاس کے ملکوں کی معلوم ہوجاتیں۔ مشرق و مغرب کا فاصلہ رکھنے والے دور دراز ملک تو اتنے سہارے سے بھی محروم۔ خود ایک ہی ذرا بڑے ملک کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا، وہاں کی خبریں لانا، وہاں اپنا پیام پہنچانا کام صرف ہمت وروں کا، نصیبہ والوں کا تھا۔ اور تو اور کسی باقاعدہ سڑک کا وجود بھی سنہ ۱۸۰۰ ق م سے قبل کم از کم یورپ میں تو نہیں ملتا۔

اس صورت حال کو وضاحت کے ساتھ ذہن میں لاکر سوال کیجئے کہ کسی عالمگیر پیام نبوت کے امکانات ہی اس وقت کیا تھے؟ عالمگیر نہ سہی ایک براعظم کو بھی دوسرے براعظم سے ملانے والی، جوڑنے والی اس وقت کونسی راہیں، سڑکیں تھیں؟ براعظم کو بھی چھوڑیئے ہندوستان، چین، روس جیسے لق و دق کسی ایک ہی ملک کے ایک گوشہ کو دوسرے گوشہ سے جوڑے رکھنے کی صورت تھی؟ ——— اس وقت تو حالات تکوینی کے لحاظ سے عین تقاضا ہی حکمتِ تشریعی کا یہ تھا کہ پیام اور

پیامبری کو محدود رکھا جاتا چھوٹے چھوٹے خطوں، مختصر علاقوں کے اندر اور یہی ہوا۔

لیکن رفتہ رفتہ اسی دنیا کے موسم نے پلٹا کھایا۔ مشینی دور کا آغاز ہوا اور اس نے گویا ملکوں اور اقلیموں کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں۔ فاصلہ کا لفظ اب بے معنی ہو گیا، اور کوئی مقام، پرانے معیار سے، اب کہنا چاہیئے کہ کہیں سے دور نہیں رہا۔ پہلے باقاعدہ سڑکیں بننا شروع ہوئیں، تیز رفتار گھوڑوں، سانڈنیوں کی نسلیں پرورش پانے لگیں ڈاک اور ہرکارے کے تصور سے دماغ آشنا ہونے لگے۔ نئی نئی سواریاں بگھیوں، ٹمٹموں، تنکرم گاڑیوں کے نام سے وجود میں آنے لگیں۔ پھر اس خشک زمین پر ریل کی پٹڑیاں بچھنے لگیں۔ پہلے دخانی اور پھر برقی قوتوں کے قابو میں آجانے سے ریل، لاری، ٹریم، موٹر سائیکل، خدا جانے کتنی اور کیسی کیسی صبا رفتار سواریاں وجود میں آگئیں۔ اُدھر ڈونگیا کشتیوں نے پہلے بادبانی اور پھر دخانی جہازوں کی شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ اور بڑے بڑے عظیم الشان جہاز سمندر کا جگر چیر چیر کر چلنے اور دوڑنے لگے۔ مشرق کے میوے مغرب میں ڈھیر ہونے لگے اور شمال کے سودے جنوب میں بکنے لگے۔ ڈاک نے سینکڑوں میل پر رہنے والوں کی خیریت دنوں بلکہ گھنٹوں میں سنا دی۔ تار نے

ہزاروں میل کی خبر منٹوں میں منگا دی۔ ٹیلیفون نے جنوب کے ڈانڈے شمال سے ملا دیئے، اور ریڈیو نے مشرق کی آواز مغرب میں پہنچا دی۔ غرض اب ہر ملک کھنچ کر دوسرے سے اتنا قریب آگیا کہ گویا ایک بڑے شہر کے دو محلے ہیں۔ دنیا کا رقبہ گویا سمٹ گیا۔ کرہ کا قطر گویا سکڑ گیا۔ پریس کی ایجاد نے کتابوں، رسالوں، اخباروں کی بھرمار نے سینما کی گرم بازاری نے، ریڈیو کی محفل آرائی نے اور سب سے بڑھ کر طیاروں کی بلند پروازیوں نے، ایک نئی قسم کی وحدت میں گوروں اور کالوں کو زنگیوں اور فرنگیوں کو، حبشیوں اور تاتاریوں کو جکڑ دیا۔ جو بچھڑے ہوئے تھے، مل گئے۔ جو بکھرے ہوئے تھے جڑ گئے۔ ایک نئی قسم کی یکرنگی کی لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ انسانیت کی مستقل تقسیم اب ملکوں اور قوموں کی ٹکڑیوں، ٹولیوں میں نہیں رہی، نسل انسانی ایک ہی قبیلہ ایک ہی خاندان بن گئی۔ مختلف محلوں میں آباد!

حکمت کاملہ کا عین تقاضا اس دور کے لئے اب یہی ٹھہرا کہ پیام مختلف قوموں، قبیلوں کے بجائے، اب صرف ایک آئے، سارے عالم انسانی کے لئے اور پیمبر کی دعوت کی مخاطب اب نہ قوم عرب ہو نہ قوم عجم، نہ بنی اسرائیل نہ بنی اسمٰعیل۔ بلکہ ساری نسل آدم ہو! قدرت کے انتظامات گرمی کے زمانے میں کچھ ہوتے ہیں سردی کے وقت کچھ۔ بہار کی رُت

میں کچھ اور، خزاں کی فصل میں کچھ اور. نظام تکوینی کا در و بست، موسم کی ہر گردش کے ساتھ آفتاب یا زمین کے ہر چکر کے ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہے ـــــ عالم اور اہل عالم کے ماحول کے اتنے بڑے عظیم الشان انقلاب کے بعد لازمی تھا کہ طرز پیام و پیامبری بدلے۔ اور تشریعی دعوت اس تکوینی نظام نو سے مطابقت اختیار کرے! گویا وہی قانون حکمت جس کا تقاضا مدت دراز تک، ہزارہا سال تک یہ رہا کہ نبوت. نسلی، قومی ملکی ہوا کرے. ٹھیک اسی قانون حکمت کے ماتحت یہ لازمی ہو گیا کہ اب جو پیمبری ہو۔ عالمگیر ہو۔ اور اب جو کتاب اور پیام آئے، وہ نوع انسان کے کسی جزو کے لئے نہیں نوع انسان کے لئے ہو۔

لیکن قدرت کے نظام تکوینی کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اصل ضرورت کے پیش آنے اور محسوس ہونے سے قبل ہی اس کے متعلق انتظامات ہر طرح کے ہو جاتے ہیں. پیاسا انسان بعد کو پیدا ہوا، بہتے ہوئے دریا، ابلتے ہوئے چشمے اس کی پیاس بجھانے کو مدتوں قبل سے وجود میں آ چکے تھے. دیکھنے والی آنکھ بعد کو کھلی،، روشنی پیدا کرنے والی، روشنی پھیلانے والی کرنیں بہت قبل سے اندھیرے کو اجالا بنائے ہوئے تھیں، دوڑنے کی مشق انسانی ٹانگوں نے بہت بعد کو کی، پیشوائی کے لئے کھلے ہوئے میدان مدتوں قبل سے حاضر تھے. انسان کے پتلے کے لئے مٹی کا خمیر بھی

ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ سورج اور چاند، ہوا اور تارے، دریا اور پہاڑ، چرند و پرند سب اس کی خدمت کے لئے مستعد اور کمربستہ، خلعت وجود سے مشرف خدا معلوم کتنی صدیوں اور کتنے قرنوں قبل سے، ہو چکے تھے۔

مخلوق کی ضرورتوں کا اندازہ داں خالق سے بڑھ کر، اور مظاہر فطرت کے لئے وقت و ساعت کا مصلحت شناس فاطر کائنات سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے؟ ریل اور تار کی ایجاد میں ابھی صدیوں کا عرصہ باقی تھا ٹیلیفون اور ریڈیو کے خوابوں سے ابھی بشر کا دماغ بیگانہ تھا۔ چین اور عرب ابھی اپنے درمیان بعد المشرقین ہی سمجھ رہے تھے کہ ندا کرنے والے نے بے دھڑک پکار دیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ وقت آ گیا اے آدم کے فرزند و خدائی پروگرام میں، کہ تمھیں ایک کامل و مکمل دین، ہر ضرورت کے لئے کافی اور ہر ماحول کے مطابق، دیدیا جائے، چنانچہ دیا جا رہا ہے اور تم سب کے ہاتھ میں بلا امتیاز رنگ و نسل، بلا تفریق حال و مستقبل، ایک نظام نامہ پہنچایا جا رہا ہے، زندگی کے ہر شعبہ، ہر پہلو سے متعلق، جامع مکمل، ہمہ گیر اور ناقابل نسخ و تبدیل ماہر آب و ہوا کے لئے، ہر طول البلد کے لئے، ہر عرض البلد کے لئے یہ قائم رہے گا قیامت تک، اور اسی چشمۂ ہدایت سے استفادہ کرتے رہیں گے، غلام و آزاد، شہری و دیہاتی

مشرقی اور مغربی، گورے اور کالے! ____ الیوم والی آیت بڑے دعویٰ کا اعلان ہے انسان کی بنیادی وحدت کا اعلان ہے۔ اور یہ اعلان اس وقت ہوا جبکہ یہ حقیقت وقت کے بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں، حکیموں سب کی نظر سے مخفی تھی۔ قرآن والوں کو کسی نافہم کے اس طعن سے ہرگز مرعوب نہ ہونا چاہیئے کہ آیت انسانی آزادی پر پابندی لگا رہی۔ اور اسے محدود کئے دیتی ہے۔ جھجکنے کے بجائے۔ نہیں اس بے مثل وبے نظیر آیت کے وجود پر فخر کرنا چاہیے۔ اور داد دینا چاہیے اس یہودی کی حقیقت سنجی کی، جو آیت کو سن کر بول اٹھا تھا کہ کہیں ہماری کتاب میں ایسی آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم تو اس دن کو یوم عید، یوم جشن بنا لیتے!

سمت پرستی ایک مستقل شرک

سورۂ بقر کی آیت ۱۷۷ اور اس کے رکوع ۲۲ کی پہلی آیت کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

لیس البِرّ ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البِرّ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ الخ	نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیر لو (نماز کے وقت) مشرق اور مغرب کیطرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر وغیرہا۔

سیاق نماز اور استقبال قبلہ کا ہے۔ اب چونکہ ہر نماز پڑھنے والا نماز پڑھتے وقت بہر حال کسی نہ کسی سمت ہی اپنا رخ رکھتا ہے۔ بلکہ متعین طور پر یوں کہئے کہ نجد، عراق، ایران، افغانستان، بلوچستان، ہندستان برما، تبت، چین، وغیرہا کے نمازیوں کے منھ تو ہمیشہ مغرب کی جانب رہتے ہیں، اور مصر، طرابلس، حبشہ، مراقش وغیرہ کے نمازیوں کے منھ ہمیشہ مشرق کی جانب۔ اس لئے قدرۃً اہل تفسیر کو یہ الجھن پیش آئی، کہ قرآن ایسی بدیہی چیز سے انکار کیسے کر رہا ہے؟ اور یہ اعلان کس طرح کر رہا ہے کہ نیکی یا عبادت یہ ہی نہیں کہ نماز میں رخ فلاں فلاں سمت کیا جائے، در آنحالیکہ مشاہدہ ہے کہ ہر نمازی اپنا رخ کسی نہ کسی سمت کی جانب رکھتا ہی ہے!

اسی دشواری سے بچنے کے لئے کسی نے یہ کیا کہ بِرّ کو کمال بِرّ پر محمول اور نیکی کو کمال نیکی کے ساتھ مقید کر دیا۔ یعنی روح عبادت، یا کمال عبادت یا مغز عبادت یہ نہیں کہ منھ فلاں فلاں سمت کیا جائے، بلکہ اصل عبادت تو یہ ہے کہ عقائد درست کئے جائیں، اللہ اور فرشتوں پر ایمان رکھا جائے اور کسی نے مراد لی، کہ نیکی صرف یہی نہیں کہ منھ فلاں سمت رکھا جائے، بلکہ مقدم چیز یہ ہے کہ عقاید کو درست کیا جائے وغیرہا ـــــ لیکن قرآن کی اصل عبارت بالکل بے غبار اور ان تکلفات و تاویلات کے بغیر بھی بالکل صاف اور بے داغ ہے۔

مغالطۂ ذہنی کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ نمازی کسی نہ کسی رخ کھڑا ہوتا ہی ہے اور قبلہ رخ ہونا نماز میں فرض عین ہے۔ اس لئے ذہن میں استقبال قبلہ اور استقبال سمت کا مفہوم ایک قرار پا گیا۔ اور قبلہ رخی مرادف ٹھہر گئی سمت رخی کے، حالانکہ دونوں چیزیں بالکل الگ، اور ایک کا مفہوم دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ قرآن یہاں جس چیز کی عبادت ہونے، نیکی سمجھے جانے کی نفی کامل کر رہا ہے ــــ الفاظ یاد رکھئے، لَیْسَ الْبِرَّ۔ نیکی یہ ذرا سی بھی نہیں ــــ وہ سمت رخی ہے، اور جس چیز کو اس نے واجب قرار دیا ہے وہ "قبلہ رخی" ہے۔ اور بچہ بچہ جانتا ہے کہ قبلہ یا کعبہ کسی سمت کا نام نہیں! ــــ سمتیں تو معلوم و معروف کل یہی چار ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال جنوب، اور یا پھر انھیں کے مرکبات مثلاً شمال و مشرق، جنوب و مغرب وغیرہ۔ کیا قرآن نے ان میں سے کسی مفرد یا مرکب سمت کو قبلہ قرار دیا ہے؟ ان میں سے کسی جانب رخ کرنے کا حکم دیا ہے؟ نہیں، بلکہ بدیہی تو یہ امر ہے کہ ہر نمازی سمت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنا رخ ایک متعین مقام، ایک متعین مکان ایک متعین عمارت کعبہ نامی کی جانب کئے ہوئے ہے! یمن والوں کو شمال کی جانب اور شام والوں کو جنوب کی جانب سجدہ کرتے کس نے نہیں دیکھا؟

قرآن نے قبلہ تو صرف ایک متعین عمارت کو مقرر کیا ہے، اور وہ جہاں سے جس جانب بھی پڑے۔ اور یہی واقعہ ہے کہ وہ کہیں سے شمال میں پڑتا

ہے، کہیں سے جنوب میں، کہیں سے مشرق میں، کہیں سے مغرب میں کہیں سے شمال و مشرق کے گوشہ میں، کہیں سے جنوب و مغرب کے زاویہ میں! ——

وہی مسافر جس نے عصر کی نماز سواری کے رخ پر پڑھی تھی، ریل یا جہاز کے مڑ جانے سے مغرب کی نماز سواری کے پہلو یا بازو کی جانب پڑھے گا، اور عشاء کی نماز سواری کے ایک بار پھر مڑ جانے کی بناء پر پھر اسی رخ کی طرف! تیز رفتار ریلوں میں تو بارہا اتفاق یہ ہوا ہے کہ نماز شروع کی ہے انجن کے رخ پر، لیکن ابھی نماز تمام نہیں ہونے پائی ہے کہ ریل کا رخ بدل گیا ہے، اور اب نمازی کا رخ بجائے انجن کی طرف ہونے کے گاڑی کے دائیں یا بائیں ہو گیا ہے! تو مشاہد کسی سمت کی جانب رُخ کرنا نہ ہوا مشاہد تو اس کے برعکس یہ ہے کہ نمازی رُخ کسی بھی متعین سمت کی جانب نہیں کرتا۔

اس مقالہ کے سامعین (اور اس کے چھپ جانے پر اس کے ناظرین) میں سے اکثر نمازی ہوں گے۔ نماز کی نیت باندھتے وقت آپ کو خیال پورب پچھم، وغیرہ کسی سمت کا بھی آتا ہے؟ یا جیسا آپ زبان سے کہتے جاتے ہیں، "منھ میرا طرف کعبہ شریف کے" خیال والتفات کعبہ ہی کا رہتا ہے؟ ارادہ تو آپ کا یقیناً صرف کعبہ کی جانب توجہ کا رہتا ہے۔ اور یہ محض تکوینی اتفاق ہے کہ کعبہ کبھی آپ سے مشرق میں پڑ جاتا ہے، کبھی مغرب میں، کبھی

اس سمت، کبھی اُس سمت، آپ کے قصد ارادہ و نیت کو ہرگز کوئی دخل سمت و تعین سمت کے باب میں نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی جو بیشمار قسمیں دنیا میں رائج رہ چکی ہیں اور اب تک ہیں، پرستاران توحید کو نہ ان کا احساس ہے نہ اندازہ۔ قرآن اپنے بلیغ انداز میں تردید ان میں سے ایک ایک خفی سے خفی صورت کی بھی کر گیا ہے مفسر غریب کیسا ہی صاحب تحقیق ہو، بہرحال ایک محدود ہی علم و نظر رکھنے والا بندہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ دنگ و حیران رہ جاتا ہے کہ یہ تیر آخر کس نشانہ پر لگایا جا رہا ہے۔ شرک کی انھیں غیر معروف لیکن نہایت وسیع صورتوں میں ایک صورت کا نام سمت پرستی یا Direction worships ہے یعنی کوئی ایک سمت (زیادہ تر سمتِ مشرق) مقدس فرض کر لی گئی اور پوجا اسی سمت کی شروع ہو گئی، اور غضب یہ ہوا کہ بعض آسمانی مذاہب بھی جب رفتہ رفتہ شرک کے شکار ہونے لگے، تو یہ سمت پرستی والا شرک بھی ان کے عقاید کا جزو بن گیا۔ قرآن کی ہمہ بین، ہمہ گیر نظر، ہر مفسر و شارح کی گرفت سے بالاتر، اس دقیقہ پر بھی پہونچی، اور اس نے صاف اعلان کر دیا کہ تم جو مشرق پرستی اور مغرب پرستی میں پڑے ہو، یہ مشرق پرستی اور مغرب روئی اپنے اندر ذرہ بھر بھی عمل خیر نہیں رکھتی، یہ ہرگز اعمال خیر میں سے نہیں، دین صحیح سے اسے

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ۔

مطلق سروکار نہیں!

مشرق پرستی و مغرب پرستی

مسیحی مذہب سے قدیم تر، یونان کا قدیم مذہب ہوا ہے، اور مسیحی مذہب اپنی موجودہ ہیئت میں بڑی حد تک اس کا خوشہ چین بھی ہے۔ اس یونانی مذہب میں دیوتا یا معبود دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک قسم کے اولمپیائی olympian gods کہلاتے تھے۔ ان کا مسکن سمت مشرق تھا۔ اور اسی لئے خود یہ سمت مقدس ہو گئی تھی۔ ان دیوتاؤں کے مندر مشرق رویہ ہوتے تھے۔ اور اہل یونان اپنی پوجا پاٹ اسی رخ ہو کر کرتے تھے۔ دیوتاؤں ہی کی دوسری قسم، کیتھولک catholic gods کہلاتی تھی۔ یہ دیوتا پہلی قسم کے برعکس سمت مغرب میں رہتے تھے۔ اور ان کے پجاریوں کے عقیدہ میں تقدس سمت مغرب میں سمٹ آیا تھا۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد ۱۲ ص ۶۱۵) کے ایک حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو مذہب میں شرف تقدس سمت جنوب و مشرق کو حاصل ہے۔ آفتاب پرست تو ہیں جتنی بھی گزری ہیں سب نے مقدس سمت مشرق کو مانا ہے۔ موجودہ مسیحیت جو بڑی حد تک معجون مرکب ہے یونانی شرک اور رومی شرک کا، اس نے یہ جہت مشرق کا تقدس بھی اپنے اندر انھیں یونانیوں اور رومیوں سے لے کر حلول کر لیا ہے چنانچہ orientation مشرق رخی مسیحیوں کے ہاں کی مخصوص مذہبی اصطلاح ہے

ان کے گرجے اسی رخ پر تعمیر ہوتے ہیں۔ شامی عیسائی اور فرقہ اسینین والے Essenes اپنی نمازیں اسی رخ پر ادا کرتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا وغیرہ میں اس پر مفصل معلومات موجود ہیں۔

بعض مشرک قوموں نے ایک فلسفہ یہ گڑھا۔ کہ جس طرح آفتاب حیات کا مظہر اور آفرینش کا دیوتا ہے۔ اسی طرح رات کی تاریکی موت کا دیوتا اور ہلاکت کا مظہر ہے اس لئے غروب آفتاب کی سمت۔ یعنی مغرب، موت و ہلاکت کے دیوتا کا مسکن ہے اور اس لئے مقدس سمت مشرق نہیں، بلکہ مغرب ہے۔ ٹائلر کی مشہور و ضخیم کتاب "ابتدائی تہذیب primitive culture اور فن کی دوسری کتابوں میں تصریحات موجود ملیں گی ــــــ غرض یہ کہ دنیا میں مشرق پرستی خوب زوروں کے ساتھ رہ چکی ہے، اور اس کے بعد مغرب پرستی بھی۔ اور اس کے بہت بعد کسی نہ کسی درجہ میں دوسری سمتوں کا تقدس بھی۔

قرآن نے ضرب اسی عقیدہ سمت پرستی پر لگائی۔ اور یونانی حکما اور رومی فلاسفہ، مسیحی فضلاء سب کے مقابلہ میں اعلان کیا، کہ سمت کوئی بھی مقدس نہیں، سمت پرستی سراسر خرافات پر مبنی ہے۔ سمتیں سمتیں سب برابر ہیں جو حکم دیا جارہا ہے، وہ تو صرف ایک مرکز کی جانب متوجہ ہونے کا ہے کہ اس سے قوم میں یکجہتی، مرکزیت پیدا ہوگی۔ اور اسی کا نام استقبال قبلہ ہے، خواہ وہ

قبلہ نمازی کے جس سمت بھی واقع ہوا ــــــ یہیں سے بعض دوسری آیتیں بھی صاف ہوئی جاتی ہیں۔ مثلاً لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یا فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ یعنی سمتیں، جہتیں، سب اللہ ہی کی مخلوق و ملک ہیں۔ کسی میں نہ کوئی الوہیت ہے، نہ تقدس۔ اللہ نہ پابند ہے کسی جہت کا نہ محدود ہے کسی سمت کے ساتھ، تم رخ جدھر بھی کروگے، اللہ ہی کا نور پاؤگے۔ باقی ایک خاص عمارت، ایک مخصوص مکان کو جو مرکز توجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ وہ امت میں وحدت، ملت میں یکجہتی اور دوسرے مصالح سے ہے۔ اور سمت پرستی کو تقویت پہنچانے والا نہیں، اس پر ضرب کاری لگانے والا ہے۔

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب۔ لیکن اللہ کے نہیں، تو اور کس کے ہوتے؟ اتنی کھلی ہوئی اور صاف حقیقت کو اس صراحت سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ضرورت تھی صاف اور کھلی ہوئی حقیقت تو یہ اب قرآن کے نزول کے بعد، اور قرآن کے ماننے والوں کو معلوم ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی ہی کب؟ مصری، ہندی، رومی قوموں نے کہا کہ مشرق سورج دیوتا کے طلوع کی جگہ ہے۔ اس لئے یہ جہت خود بھی مقدس ہے، رومیوں کی تقلید میں مسیحی بھی آفتاب پرستی کے دوسرے عنصروں کی طرح مشرق کے تقدس کے قائل ہوگئے، اور مشرق رخی orientation وغیرہ کے مسئلے

اپنے ہاں گڑھ لئے۔ للّٰہ المشرق والمغرب ان سب کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان میں تقدس اور شان الوہیت ہونا تو کجا، دوسروں کا حاجت روا ہونا تو الگ رہا۔ جہت مشرق و جہت مغرب خود اپنی جگہ پر بھی تو آزاد، مطلق العنان، خود مختار نہیں۔ اللہ کے مخلوق ہیں، مغلوب ہیں، محکوم ہیں۔ اپنے وجود میں اس کے محتاج، اپنی بقا میں اس کے محتاج، اپنے قیام میں اسی کے قاعدوں، ضابطوں کے تابع! —— نام انھیں دو سمتوں کا صراحت کے ساتھ اس لئے لیا گیا کہ یہی دو سمتیں سب سے زیادہ شرک پرور رہی ہیں، مشرکانہ عقاید کی سب بڑی امید گاہیں رہی ہیں۔

عقیدۂ تجسیم پر ضرب فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ لے خدائے واحد کے پرستار اور شرک و شبۂ شرک سے بیزار مسلمانو! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا بھی پابند ہے کسی سمت کا مقید ہے کسی جہت کے ساتھ۔ تم جدھر بھی اپنا منھ کرو، نماز، دعا، عبادت کے لئے بس خدا اسی طرف ہے، وہ پاک ہے ہر سمت سے۔ منزہ ہے ہر جہت سے۔ اس کی ذات پاک کے تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں۔ جدھر بھی رخ کروگے، جلوہ اسی کا پاؤگے۔ کون سی جہت، کون سا مکان، کون سا گوشہ اس سے خالی ہے؟ —— یہ سب تردید ہو رہی ہے عقیدہ تجسیم کی Anthropomorphism کی۔ وہی عقیدۂ تجسیم، جو جزو لاینفک ہا ہے

نہ صرف وحشی قوموں کے مذہبوں کا۔ بلکہ جہاں تک انگریزی میں لکھے ہوئے تذکرۃ الادیان سے پتہ چلتا ہے، چینی مذہب کا، مصری مذہب کا، کلدانی مذہب کا، ہندی مذہب کا، یونانی مذہب کا، رومی مذہب کا، مسیحی مذہب کا، خصوصًا اس کی لاطینی شاخ کا، اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ خود اسرائیلیوں کے بھی مذہب توحید کا!

آیت کے خاتمہ کے الفاظ ہیں، اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیمٌ۔ اللہ تو خود ہی انتہائی وسعت رکھنے والا ہے، ہر شے پر وسعت رکھنے والا ہے۔ ساری وسعتیں خود اس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، وہ کس وسعت کے اندر سما سکتا ہے؟ ساری سمتوں، جہتوں کو تو وہ خود ہی احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس کا احاطہ کون سمت، کون جہت کر سکتی ہے؟ وہ کس طرح کسی جہت سے مقید، کسی سمت سے محدود ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی وہ انتہائی علم والا بھی ہے کامل علم رکھنے والا ہے مخلوق کی ہر ضرورت کا، کائنات کی ہر مصلحت کا۔ وہ اپنے اس علم کامل کے لحاظ سے جس مکان کو چاہے قبلہ مقرر کر دے، جس عمارت کو چاہے مرکز توجہ ٹھہرا دے سارے عبادت گزاروں کا۔ اس مرکزیت و یکسوئی کے تعین میں اصلاً دخل نہ کسی جہت کے تقدس کا ہے نہ کسی سمت کے خدائی ہونے کا!

خدا کا متبنّیٰ آیت ۱۱۵ ختم ہو گئی سورۂ بقر کی۔ مسئلہ وہی صفات خداوندی کا چل رہا ہے۔ آیت ۱۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ۔ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے بنا رکھا ہے ایک بیٹا یہ کہنے والے، اس قول کے قائل کون ہیں؟ وسیع معنی میں بہت سے اہل باطل مراد ہو سکتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ کی فرزندی کا عقیدہ بہت سی قوموں میں عام و مشترک ہے۔ لیکن خصوصی معنیٰ میں مراد انھیں سے ہے جو اپنے کو مسیحی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے "خدا کے ایک بیٹا ہے" نہیں۔ الفاظ قرآنی ہیں اتخذ اللہ ولدًا، خدا نے رکھا ہے ایک بیٹا ——— قرآن آخر خدا کا کلام ہے، غریب مفسر، غریب شارح غریب بندہ، ہر ہر اشارہ، ہر ہر تلمیح کو کہاں تک اپنے فہم و ادراک کی گرفت میں لا رہا ہے! ——— مسیحیوں کا عام عقیدہ جو اس باب میں ہے، معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ ایک تو خدا ہے، اور ایک خدا کا بیٹا ہے وہ بھی قدیم، یہ بھی قدیم۔ وہ بھی غیر مخلوق، یہ بھی غیر مخلوق۔ وہ بھی ازلی، یہ بھی ازلی۔ لیکن انھیں مشرک مسیحیوں کے اندر، گو نسبتہ ان سے بلند تر، ایک فرقہ، قدیم و زبردست، مسیحیوں کا ایسا بھی گزرا ہے، جو کہتے تھے، کہ عیسیٰ مسیح اصلاً خدا نہ تھے، اپنی سرشت کے لحاظ سے انسان ہی تھے جیسے ہم آپ ہیں البتہ روح القدس کی روحانیت کا فیضان ان پر شروع سے تھا اور اسکی

شدت اس درجہ ہوئی کہ وہ ہمہ تن تقدس کے رنگ میں ڈوب گئے اور خدا نے جب ان میں خدائی رنگ اس نوبت پر پایا تو انہیں اپنا بیٹا بنا لیا، اپنی خدائی میں شریک کر لیا۔ اپنی تبنیت سے مشرف کر دیا۔

انگریزی میں اصطلاحی نام اس عقیدہ کا Adoptianism ہے اسکا ترجمہ "تبنیت" ہو سکتا ہے اور اس فرقہ کو انگریزی میں Adoptionist کہتے ہیں۔ مسیحیت کی قدیم تاریخیں اس فرقہ کے تذکرہ سے لبریز ہیں۔ مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں اس فرقہ کا خاصہ زور تھا۔ حال میں جرمن محقق ہارنک Harnack نے اپنی "تاریخ العقیدہ" History of Dogma میں تفصیل سے دکھایا ہے کہ ۱۹۰ء میں تھیوڈوٹس بازنطینی Theodotus of Byzantine نے اس عقیدہ کو روم میں خاص طور پر چمکایا تھا جو اس پر تو ۱۹۵ء میں حکم تکفیر لگ گیا لیکن اس کے شاگرد وارٹیمن Arteman نے اس تعلیم کو جاری رکھا اور مشرق میں بریلس لبطروی Brylles of Bostia پولوس سموسطوی Paul of Samosata اس کے علمبردار ہو گئے، یہاں تک کہ پادری ایریس Arius اور نسطوریس Nestorins کے واسطے سے بین ظہور اسلام تک اس کا دم خم قائم رہا۔ اور آٹھویں صدی اور بارھویں صدی عیسوی میں پھر اس کا بار بار زور بندھا۔ شرک تثلیثی کی اور صورتوں سے یہ صورت نسبتہً خفی ہے۔ قرآن نے اشارہ اسی فرقہ کے عقائد کی جانب

کیا- اور قرآن کی بلاغت معنوی کی داد دیجئے کہ ایک لفظ اتخاذ ولد لاکر تاریخ مسیحیت کے کتنے اہم و وسیع باب کو اپنے اندر سمیٹ لیا!

ملکیت کاملہ

سُبْحٰنَهٗ معاً بعد سُبْحٰنَهٗ! خدائے پاک پاک ہے اس قسم کی مادی قرابتوں، رشتہ داریوں سے اسے ایک طرف خدا بھی کہے جاتے ہو، اس کی قدرت کا کلمہ بھی پڑھتے ہو، اور پھر محتاج سمجھتے ہو اسے اس کا، کہ وہ دنیا کے لاولد لوگوں، اور لاولدی کے نقصانات محسوس کرنے والے انسانوں کی طرح، کسی کو گود لے کر اپنی لاولدی کی تلافی کرے! یہ کیا لغو خیالی اور کیسی پریشان دماغی ہے. بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. اس کا تو سب ہی کچھ ہے. اعلیٰ و ادنیٰ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے صحیح رشتہ اس کے اور اس کے مخلوقات کے درمیان مِلک کا ہے، وہ سب کا مالک سب اُسکے مملوک. جس سے جو چاہے، کام لے. اسے ضرورت کیا کسی کو گود لینے کسی کو بیٹا بنانے کی؟ مِلک کا تعلق تو فرزندی و تبنیت کے تعلق سے کہیں زیادہ قوی موجود ہے. آخر اس کے لئے ممکن ہی کونسا ارمان ہے، کہ اس کے پورا کرنے کے لئے کسی کو متبنٰی بنانے کی حاجت پیش آئے؟ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ. سب اس کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہیں. بڑے سے بڑے گردن کش بھی اطاعتِ اضطراری و طبعی پر مجبور، احکام شریعت سہی، قوانین تکوینی کی فرمانبرداری سے تو کسی کو بھی چارہ نہیں. بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ

والارض اور یہ جتنا کہ آسمان اور لق و دق زمین اور دیوتوں قوموں کی خیالی
انہیں کے آگے زمین پر لگ گئیں، یہ دیویاں ہیں نہ دیوتا نہ صاحب اختیار و
صاحب تصرف. یہ تو خود مخلوق و مجبور بے کس و بے اختیار ہیں. اللہ موجد
ہے ان سب کا۔ لفظ بدیع خیال میں رہے. وہ انہیں نیست سے ہست کرنے
والا ہے. عدم محض سے وجود میں لانے والا ہے. بغیر
کسی آلہ کی مدد کے. بغیر کسی سابق الوجود مادہ کے
بغیر کسی سابق الوجود نمونہ کے اور محض صانع یا کاریگر نہیں کہ ایک نمونہ کو
دیکھ کر اس کی نقل اصل سے ملا دی. یا کوئی مادہ پہلے سے موجود تھا اسے اپنی
ترتیب اور ترکیب سے ایک خاص صورت دیدی ــــ اس ایک لفظ
میں رد آ گیا ان سارے مشرکانہ مذاہب کا، جو خدا کو محض ایک صناع یا کاریگر
کا درجہ دیتے ہیں. اور تردید ہو گئی ان سارے مشرک فلسفیوں کی جو ایک
طرف خدا کو خدا بھی مانے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ
روح کو قدیم اور مادہ کو غیر حادث قرار دیئے جاتے ہیں. قرآن مجید کے اس قسم
کے چھوٹے چھوٹے فقروں، مفرد لفظوں کی پوری قدر جبھی ہوتی ہے جب دنیا
کی باطل پرستیوں کی تاریخیں اور نمونے تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے ہوں.

نبی کا مفہوم قبل اسلام

سورہ مائدہ میں ایک جگہ آتا ہے. انا انزلنا التورٰۃ فیھا ھدی و نور یحکم بھا

النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا۔ اس میں النبیون کیساتھ ذکراً جو الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا کا لگا ہوا ہے اس نے قدیم مفسرین کے لئے اچھی خاصی الجھن پیدا کردی۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے توریت نازل کی جس کے اندر ہدایت اور نور ہے۔ اسی کے مطابق وہ نبی جو اللہ کے مطیع تھے، یہودیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ ——— جو نبی اللہ کے مطیع تھے، کیا معنی؟ کیا کوئی نبی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے مطیع نہ ہوں؟ فرماں بردار ہونے کی جگہ نافرماں ہوں؟

اشکال اس بنا پر ہوا کہ ذہن کے سامنے تصور اس "نبوت" کا رہا جو ایک اسلامی اصطلاح بن چکی ہے اور اس میں نبوت کے معنی لازمی طور پر نبوت الٰہی ہی کے ہیں۔ لیکن صاحب قرآن کو تو بہر حال معلوم تھا کہ یہود کے ہاں نبوت کا یہ تخیل ہی نہیں۔ ان کے سارے مذہبی ادب میں نبی کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خبر دینے والا، پیشین گوئی کرنے والا، عام اس سے کہ اس کا تعلق خدا سے ہو یا شیطان سے زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ صاحب کشف ہو۔ مشرک قوموں میں جو مرتبہ کاہن کا ہوتا ہے ٹھیک اسی سے ملتا جلتا منصب یہود کے ہاں نبی کا ہوتا ہے۔ صرف اس میں اشراقیت ہونا ضروری تھی جو بعض کو طبعاً وجبلۃً حاصل ہوتی ہے، اور بعض کو مشق و ریاضت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ صداقت، حقانیت، روحانیت، تعلق باللہ، حکمۃ، اصلاح خلق و تزکیہ نفس سے اسکا بہرہ مند ہونا ہرگز ضروری نہ تھا

چنانچہ توریت میں ایک جگہ اور ضمناً و اجمالاً نہیں، متعدد جگہ اور صراحۃً تفصیلاً ذکر ایسے نبیوں کا ملتا ہے، جو کفر کی دعوت دینے والے اور شرک کی طرف بلانے والے تھے۔

توریت کی کتاب استثنا، میں ہے:۔

"اگر تمہارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمہیں کوئی نشان یا معجزہ دکھلا دے اور اس نشان یا معجزہ کے مطابق جو اس نے تمہیں دکھایا بات واقع ہو اور وہ تمہیں کہے آؤ ہم غیر معبودوں کی جنہیں تم نے نہیں جانا پیروی کریں اور ان کی بندگی کریں، تو ہرگز اس نبی یا خواب دیکھنے والے کی بات پر کان مت دھرو اور وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا" (۱۳: ۱-۵)

اس میں صریحاً دعوت شرک و ضلالت دینے والے کو نبی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ایسے نبی کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا اقتباس اسی کتاب استثنا کا اور ملاحظہ ہو:۔

لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے کہ جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تو اپنے دل میں

ہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خدا کی کہی ہوئی نہیں. تو جان
رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور وہ جو اس نے کہا
ہے واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی، بلکہ اس نبی نے
گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈرنا (۱۸: ۲۰-۲۲)

تیسرا اقتباس اس حقیقت کو پوری طرح واضح کئے دیتا ہے کہ بنی
اسرائیل میں نبوت بالکل کہانت کی قسم کی ایک چیز ہو گئی تھی اور انبیاء اور کاہنوں
کا درجہ ایک ہو گیا تھا یرمیاہ نبی اپنی سرگزشت کا ایک حصہ یوں سناتے ہیں:

"تب میں نے کہا ہائے اے خداوند یہوواہ! دیکھ انبیاء ان سے کہتے ہیں کہ تم
تلوار نہ دیکھو گے، اور تم پر کال نہ آئے گا بلکہ میں اس مکان میں تم کو ایسی
سلامتی دوں گا جو قائم رہے گی تب خداوند نے کہا کہ انبیاء میرا نام لے کر
جھوٹی نبوت کرتے ہیں، میں نے انہیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا نہ
انہیں کہا. وہ جھوٹی رویا اور جھوٹا علم غیب اور بے اصل باتیں اور
اپنے دلوں کی مکاریاں، نبوت کی طرح تم پر ظاہر کرتے ہیں. اس لئے
خداوند یوں کہتا ہے ان نبیوں کی بابت جو میرا نام لے کے نبوت کرتے
ہیں جنہیں میں نے نہیں بھیجا اور جو کہتے ہیں کہ تلوار اور کال سے ہلاک
کئے جائیں گے. اور جن لوگوں سے وہ نبوت کرتے سو وہ کال اور تلوار
کے سبب یروشلم کے کوچوں میں پھینک دیئے جائیں گے اور ان کی

جوروئیں اور ان کے بیٹے اور بیٹیاں اور ان کا گاڑنے والا کوئی نہ ہوگا کہ ان کی برائی ان پر ڈالوں گا" (یرمیاہ ۱۴ - ۱۴ : ۱۴ - ۱۶)

کاہنوں ہی کی طرح یہ جھوٹے نبی بھی عذاب الٰہی کے مستحق اسی دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ اسی کتاب یرمیاہ میں ہے:۔

"خداوند یوں کہتا ہے دیکھو میں اس سرزمین کے سارے رہنے والوں کو ہاں ان بادشاہوں کو جو داؤد کے تخت پر بیٹھے اور کاہنوں اور نبیوں اور یروشلم کے سارے باشندوں کو مستی سے لبالب کرونگا اور میں ان میں سے ایک دوسرے پر بیٹوں اور باپوں کو ایک ساتھ ڈال دونگا" (۱۳ : ۱۳ و ۱۴)

حزقی ایل نبی کی کتاب میں بھی اس قسم کے بنے ہوئے نبیوں اور ان کی بیہودگیوں اور سزاؤں کا ذکر ہے:۔

"اے آدم زاد اسرائیل کے نبیوں سے جو نبوت کرتے ہیں انکا مخالف ہو کر نبوت کر اور ان سے جو اپنے دل سے نبوت کرتے ہیں ان سے کہہ کر خدا کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ بیہودہ نبیوں پر واویلا ہے جو اپنی ہی روح کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے کچھ نہیں دیکھا اے اسرائیل تیرے نبی ان لومڑیوں کی مانند ہیں جو اجاڑ مکانوں میں رہتیں۔ وہ لوگ اور

جھوٹا شگون دیکھ کے کہتے ہیں کہ خداوند کہتا ہے اگرچہ خداوند نے انہیں نہیں بھیجا ہے اور اوروں بنی امید پیدا کرتے کہ سخن پورا ہو جائے گا۔ کیا تم نے باطل رویا نہیں دیکھی۔ کیا تم نے جھوٹی غیب دانی نہیں کی؟ اور بولتے ہو کہ خداوند نے کہا ہے کہ اگرچہ میں نے نہیں کہا۔ اور میرا ہاتھ ان نبیوں پر جو دھوکا دیتے ہیں اور جھوٹی غیب دانی کرتے ہیں۔ (حزقی ایل۔ ۱۳: ۱۔۹)

یہ چند اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر دیدیئے گئے۔ ورنہ اور بھی بہت سے اسی مفہوم و مضمون کے توریت میں مل جاتے ہیں۔ اور جعلی نبی کی سزا بھی شریعت یہود میں یہ ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا جائے (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۱۰۔ ص ۲۱۲ کالم ۱)

تاریخ بنی اسرائیل میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ نبی کے بجائے "غیب بین" کی اصطلاح رائج تھی۔ توریت میں اس کی تصریح موجود ہے:-

"اگلے زمانے میں بنی اسرائیل کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی خدا سے مصلحت کرنے جاتا تھا تو کہتا تھا کہ آؤ ہم غیب بین کے پاس جائیں اس لئے کہ جواب نبی کہلاتا ہے آگے غیب بین کہلاتا تھا"

(۱۔ سموئیل۔ ۹:۹)

قرآن مجید نے انبیاء اسرائیل کے ساتھ اَلَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا کی قید لگا کر

اسرائیلی نبوت کی تاریخ کے دریا کو گویا کوزہ میں بند کر دیا، تفسیر کی ساری الجھنیں دور کر دیں۔ اور اشارہ کر دیا کہ یہاں مراد سچے اور صحیح انبیاء ہیں۔ اسلامی اصطلاح والے انبیاء ہیں۔ غیب بین اور کاہن اور اسرائیلی اصطلاح والے انبیاء مراد نہیں۔

حضرات! صحبت بہت طویل ہو گئی، آپ کب تک سنیئے جائیں گے یہ چند قدیم مسائل جدید روشنی میں محض نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے، ابھی قرآنی مسائل بیسیوں نہیں، بلکہ پچاسوں شاید سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اور ہیں کہ ان پر علوم جدید، اور تحقیق مزید کی روشنی اور پڑے تو مضمحل و مجروح ہونے کے بجائے وہ اور زیادہ نکھر آئیں گے۔ ان کے جوہر اور زیادہ چمک اٹھیں گے۔

(۲)

جدید قصص الانبیاء

(۱) ابوالبشر آدمؑ

دنیا بن کر تیار ہو چکی، زمین کا فرش اپنی رنگینیوں اور بوقلمونیوں کے
ساتھ بچھ چکا ہے، آسمان کی چھت اپنی بلندیوں کے ساتھ قائم ہو چکی ہے
آفتاب اور ماہتاب کے ہنڈے روشن ہو چکے ہیں، تاروں کے ننھے ننھے
دمکتے ہوئے کروڑوں دیئے رات کے اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر چکے ہیں، گھوڑے
ہاتھی، مچھلی، مچھر، فاختہ، کبوتر، شکاری جانور زمین پر، سمندر میں، ہوا
فضا میں زندگی کی سانس لے رہے ہیں، ندی دریا کی جگہ دریا موجوں کا لطف
دکھا رہے ہیں، پہاڑ کی جگہ پہاڑ اپنی ہیبت دلوں میں بٹھا رہے ہیں، نور
سے بنے ہوئے فرشتے، نار سے بنے ہوئے جنات، سب مخلوقات وجود سے مشرف

ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ مجلس کائنات ہر طرح آراستہ۔

انتظامات مکمل ہو چکے، تو اب حکمت کاملہ کو منظور ہوا کہ محفل میں قدم رونق محفل سے آگیں اور نہ صرف نفاذ احسان والے کے قانون کا شروع ہو قانون تکوینی ([illegible]) تو شروع ہی سے نافذ تھا۔ اب منظور ہوا کہ سکے قانون تشریعی ([illegible]) کا بھی اختیاری تعمیل اول دن سے ہو دی گئی۔ اب وقت اس کا آیا کہ جنس عقل و ارادہ کے ساتھ صاحب اختیار کے ساتھ ہو۔ مخلوقات کی صف میں سب سے مقرب سے مقرب فرشتے تھے۔ ارشاد انہیں سے ہوا۔ مجھے خبر ہے؟ ہو دیتا ہوں کہ ایک تازہ مخلوق آنے کو ہے۔ وہ ہونے زمین پر ہمارا خلیفہ ہوگا، ہمارا قانون چلائے گا فرشتے غیب داں نہ تھے۔ لیکن بہرحال فہم و فراست سے تو حصہ دار تھے ہی، اور حاضر پر غائب کو قیاس کر ہی سکتے تھے۔ تو اسے بشری کی ترکیب اور زمینی مخلوقات کی ضروریات و مقتضیات کا اندازہ لگا، دل میں سمجھا اور سمجھتے تھے کہ اس نئی مخلوق کی ذریات میں کچھ سرکش و غدار، عاصی و نافرمان ضرور ہی پیدا ہوں گے، بولے، اور وفا سرشت بندوں کی طرح آقا پر تڑپے جوش وفا سے لبریز ہو کر بولے، کہ حضور والا! ہم خدام قدیم آخر کس دن کے لئے ہیں؟ جو کچھ خدمت ہم سے لیجئے ہم و جان اس کے لئے حاضر ہیں۔ [illegible] حضرت جو ہم سے ہیں، نفس اور ارادہ بھی تو ساتھ لا رہے ہیں۔ آپس میں لڑیں گے،

بھڑ بیٹھے جا گے۔ جھگڑ دیں گے اور ایک دوسرے کا سر اور سرکار کا قانون توڑیں گے، طبع مبارک کی گرانی کے سبب بنیں گے۔ یہ منظر ہم جاں نثاروں سے کس دل سے دیکھا جائے گا۔" جواب میں ارشاد ہوا کہ "تمہاری خیر خواہی مسلّم لیکن تمہارا علم بہر حال محدود۔ تم نے وہی کہا جو تمہیں اپنی بصیرت کے مطابق نظر آیا۔ تمہیں کیا علم ہماری نامحدود حکمتوں کا، بے پایاں مصلحتوں کا؟ جو کام اس نئی مخلوق سے لینے ہیں۔ اس کو قوتیں بھی تو لیس گے انہیں کے مناسب انہیں کے متناسب!

خاموشی ملاءِ اعلیٰ پر چھا گئی۔ نار و نور دونوں سے الگ، اور دونوں کے خواص ترکیبی سے جدا، خاک کا ایک پتلا تیار ہوا۔ اور اس کے اندر روح الٰہی دم ہوئی۔ روح کا دم ہونا تھا کہ گیلی مٹی کا خمیر کیا ہوا اور اب خشک، اور کھنکھناتا ہوا پتلا، دم کے دم میں جیتا جاگتا، دانا و بینا آدم بن گیا۔ سلسلۂ نسل انسانی کا مورثِ اعلیٰ، علوم و معارف سے بہرہ ور، آخر خلیفۃ اللہ تھا نہ۔ یہ کیا لفظ بول گیا؟ اصل قصّہ کا سررشتۂ بیان چھوڑ، چند لمحوں کے لئے ذرا اسی لفظ کو دہرا لیجیے۔ اور اسی کی معنویت پر دھیان جما لیجیے۔ "خلیفۃ اللہ" کی یہی حیثیت تو آدم کی اصلی اور اہم ترین حیثیت تھی۔ قرآن مجید میں جہاں خلقت آدم کا بیان پہلی بار آیا ہے، یہ نہیں وارد ہوا ہے، کہ جب ہمیں نوعِ انسانی کی آفرینش منظور ہوئی، یا سلسلۂ بشری کا پہلا انسان پیدا کرنا منظور ہوا۔ بلکہ ارشاد ہوا ہے

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔

یعنی یاد کرو وہ وقت جب پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ آدمؑ کو ابوالبشر مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مسیحیوں نے بھی مانا ہے۔ لیکن ملاحظہ ہو کہ بائبل میں یہ ذکر کس انداز سے اور کس محل پر آتا ہے۔ اوپر سے ذکر آسمان و زمین اور جمادات و نباتات، حیوانات کی پیدائش کا چلا آتا ہے۔ کہ اسی پلیٹ میں یہ تذکرہ بھی آجاتا ہے؟

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے۔ اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ سو آدم جیتی جان ہوا"

(پیدائش ۲۔۵۔۷)

گویا جس طرح اور سب جانوروں کی نوعیں پیدا ہوئی تھیں، ایک جاندار انسان نامی کی بھی نوع پیدا ہوگئی۔ اور اس سلسلہ کے بانی کا نام آدم رہا! اور گویا اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے، کہاں مادیت، حیوانیت کی یہ پستی اور کہاں نصب العین کی یہ بلندی، کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ اسے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ اپنے خالق کے روبرو ہونا ہے۔ پہلی بات تو لفظ خلیفہ کے تلفظ کے ساتھ ہی یہ سمجھ میں آگئی۔ پھر اتنا ہی

نہیں۔ وہ دوسروں کی بھی تکمیل کرے گا۔ اخلاقی، عقلی، روحانی اصلاح میں لگا رہے
گا۔ اور روئے زمین پر معدلت اور سیاست کی شریعت کا سکہ چلائے گا۔ یہ
سارا مفہوم ذرا سے لفظ خلیفۃ اللہ کے اندر شامل!

پھر ایک اور گوشہ سے روشنی اس حقیقت پر ڈالئے۔ ایک اور زاویہ
سے اسے جانچئے۔ ایک اور پیمانہ سے اسے ناپئے۔ آفرینش تو جس طرح آدم
کی ہوئی ہے۔ اسی طرح آخر ساری مخلوق کی ہوئی ہے۔ جمادات و حیوانات کی
بھی ملائکہ اور جنات کی بھی، عرش کی بھی، کرسی کی بھی۔ لیکن اور کسی کے بھی
ارادۂ تخلیق کا ذکر قرآن نے اہتمام کے ساتھ کیا ہے؟ یہ فخر تو صرف خلقت
آدم کے موضوع کو ملا۔ اور کیوں نہ ملتا؟ نایب السلطنت کا ورود، اور عوام الناس
کی نقل و حرکت کہیں ایک درجہ کی چیزیں ہیں؟ ——— اللہ اللہ خاک کے پتلے
کا یہ شرف و مرتبہ! مذاہب شرکیہ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ انسان کے شرف و احترام
کا یہ مقام، یہودیت نے کب جانا ہے؟ مسیحیت نے کب پہچانا ہے؟ اہل کتب
کی کتاب کا حوالہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

اچھا اب پھر آجائیے اصل قصہ کی طرف۔ آدم (Vicegerent
Designate) خلیفہ نامزد ہو چکے۔ اب فرشتے بلائے گئے، کہ وہی مخلوقات
میں سب سے داناتر، عالم تر، کامل تر تھے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا اشیائے کائنات
کے خواص تو بیان کرو۔ نہ بیان کر سکے، کہ اس علم سے کورے تھے۔ اسی علم سے

کام انھیں پڑنے والا ہی نہ تھا ـــــ ذکر و شغل میں لگے رہنے والے صوفیوں اور زاہدوں کو حدیث کے نقد سے، رجال کی جرح سے، فقہ کے نقادی سے قانون کے احکام سے آخر واسطہ ہی کیا؟ ـــــ اشارہ آدمؑ کو ہوا۔ آپ نے بھی فرفر سنادیا۔ تسبیح و تقدیس کرتی رہنے والی معصوم مخلوق بے اختیار نعرہ لگا اٹھی۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا — پاک ہیں آپ اے ہمارے سرکار

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔ — پاک ہیں اس سے کہ آپ کا کوئی بھی

فعل حکمت سے خالی ہو۔ مصلحت سے عاری ہو ہمیں علم ہی کیا ہے؟ ہاں بس وہی تھوڑا بہت جو آپ ہی نے ہمیں عطا کر رکھا ہے ہمارے علم جزئی کو آپ کے علم کلی سے نسبت کیا؟ حقیقۃً علم والے تو آپ ہیں کہ آپ کے لئے حاضر و غائب قریب و بعید، ماضی، مستقبل سب یکساں، عالم کل آپ ہیں ہر مخلوق کے ظرف کے، استعداد کے، صلاحیت طبع کے! اور حکمت والے بھی آپ ہی کہ بشر و ملک ہر مخلوق میں تقسیم علم اسی کے استعداد کے مطابق۔ اسی کے ظرف کے متناسب کر دی!

یہ منظر برخاست۔ اب پردہ دوسرے منظر سے اٹھتا ہے۔ آدمؑ کے سر پر اب خلافت الٰہی کا تاج ہے۔ حکم فرشتوں کو ملتا ہے کہ ہمارے اسی نائب کے آگے جھکو۔ نذرانہ عقیدت اس کے سامنے پیش کرو اُسْجُدُوْا لِآدَمَ۔

میں سجدہ اپنے لغوی معنی میں ہے۔ سجدۂ خضوع نماز کا اصطلاحی سجدہ مراد نہیں، نماز کے سجدہ کو بھی سجدہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تذلّل و تواضع کا بہترین مظہر ہے اور پھر اہل تحقیق کی یہ تصریح بھی موجود ہے کہ لِاٰدَمَ میں حرف لام، معنی میں، اِلیٰ یا سمت و جہت کے ہے۔ سجدہ آدم کو نہیں، صرف سمت آدم میں تھا آج عالم اجسام میں، تکلیفات شرعیہ کے پورے ظہور کے وقت بھی سجدہ کعبہ کو نہیں، رب کعبہ کو کیا جاتا ہے۔ کعبہ صرف سمت ہے۔ کل اسی طرح عالم ارواح میں جب تکلیفات شرعیہ کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ سجود آدم نہیں۔ آدم آفرین ہی تھا۔ پیکر آدم صرف سمت سجدہ تھا۔

بہر حال حکم اظہار اطاعت کا فرشتوں کو ملا۔ اور جب فرشتوں کو ملا، تو ظاہر ہے کہ ان سے ادنیٰ مخلوق کو پہلے ہی مل چکا۔ اور یہ بات ایسی کھلی ہوئی۔ اور اتنی موٹی ہے کہ قرآن مجید نے اس کی صراحت ضروری نہ سمجھی۔ خیر حکم کی تعمیل سب نے کی۔ ایک نہ کی تو آگ کے بنے ہوئے ایک جن ابلیس نامے نے۔ انانیت کی آگ سے جل کر بولا "میں آتشی ہو کر خاکی کے آگے جھکوں؟ ادنیٰ کے آگے اعلیٰ اپنے کو جھکائے گرائے؟ ناممکن!" اپنی عقل پر نازاں، بے وقوف اتنا نہ سوچا۔ کہ خود اسی کی کیا دلیل ہے۔ عقلی یا نقلی۔ کہ آگ ہر حال میں خاک سے افضل ہی ہے اور بالفرض ہو بھی۔ تو یہ کس قاعدہ سے ثابت ہے۔ کہ کسی خاص مصلحت سے یا کسی مخصوص حکمت کی بنا پر بھی بڑا چھوٹے کے آگے کسی حال

میں نہ جھکے؟ غرض اس منطق ابلیسی کے صغریٰ وکبریٰ دونوں غلط! نکالا گیا ملاءِ اعلیٰ سے۔ پھینکا گیا آسمان سے۔ حکم کی نافرمانی کی علت میں۔ حکم بھی کس کا؟ حاکم برحق کا، حکیم مطلق کا!

ابلیس نکلنے کو تو نکلا، لیکن اکڑ کے ساتھ۔ اکڑ وہی جس کا نام آج کی ادبی بولی میں "پندارِ تفوق" ہے۔ کہتا ہوا نکلا۔ کہ "میں تو جا رہا ہوں لیکن اپنے ساتھ اور بھی تیرے بہت سے بندوں کو لے مروں گا۔" ارشاد ہوا "چل دور ہو۔ جو تیری راہ چلنا چاہیں گے وہ اپنا کیا ہوا خود ہی بھگتیں گے باقی جو لوگ اپنے ارادہ و اختیار سے صحیح کام لیتے رہیں گے۔ اور ہمارے نازل کئے ہوئے پیمبروں کی راہ پر قائم رہیں گے۔ ان پر تیرا جادو کچھ بھی نہ چل سکے گا۔ تیرے پاس قوت ہی کیا ہے۔ بجز وسوسہ اندازی کے۔" ادھر یہ ہوا، اُدھر آدم مع اپنی صاحبہ حوا کے مزے چین سے جنت میں رہنے بسنے لگے۔ ممانعت صرف ایک خاص درخت کے پاس جانے کی تھی۔

دونوں غافل و بے خبر اسی عیش میں تھے۔ کہ موقع مل گیا ابلیس کو وار کرنے کا۔ ابلیس کا صفاتی نام اب شیطان تھا۔ پٹی ایک روز یہ پڑھائی کہ "مزے سے جائیے آپ نہ اس درخت کے پاس۔ وہ ممانعت جو ہوئی تھی وہ تو عارضی تھی۔ اس وقت آپ کے قویٰ میں پختگی نہیں آئی تھی۔ اب آپ ہر طرح پختہ ہو چکے۔ جائیے اور بے تکلف کھائیے پھل اس درخت کے۔ اور سنئیے،

کان ادھر لائیے۔ بات کان میں کہنے کی ہے۔ اس پھل میں تاثیر یہ ہے کہ ایک بار زبان پر رکھ لیجئے تو بس سمجھئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کے ہو گئے بس یہیں جم گئے۔ آپ کو میری بات کا اور میری خیر خواہی کا یقین کیوں نہ آنے لگا تو لیجئے میں قسم کھا کر کہتا ہوں اپنے اور آپ کے پروردگار کی۔ اور آپ تو عاشق ٹھہرے اُن کے نام کے:

محبوب کا نام سن کر عاشق پھسل پڑا۔ اس کا طائر فکر یہاں تک پہنچ ہی نہ سکا۔ کہ اس کے محبوب کا نام کوئی بے وقعتی یا بے قدری کے ساتھ لے سکتا ہے۔ حضرت آدم تو حریص ہی تھے دل و جان سے مقام قرب حق میں قیام کے۔ ادھر ذہن ہی نہ گیا۔ کہ کہنے والا ہے کون؟ اور کس نیت سے یہ افسوں پھونک رہا ہے۔ بس اس کے پھسلاوے میں آ پھل کھا بیٹھے پھل کا کھانا نہ تھا۔ کہ پھل کے طبعی اثرات ظاہر ہونے لگے۔ برہنگی اب تک چھپی ہوئی تھی اب ظاہر ہو گئی۔ اور زندگی جو چھپ گئی تھی۔ اب احساس غلطی کا ہوا۔ اور دور شروع ہوا توبہ کا ندامت کا استغفار کا۔ آخر قصور معاف ہوا۔ مرتبہ مقبولیت پر بحالی ہوئی لیکن بہر حال طبعی اثرات، گناہ دھل جانے کے بعد بھی قانون تکوینی کے ماتحت ظہور کر ہی رہے ہیں۔ سنکھیا کھا کر توبہ و ندامت سے خودکشی کا گناہ ممکن ہے کہ معاف ہو جائے لیکن جسم پر موت کے مادی اثرات تو طاری ہو کر ہی رہیں گے۔ جنت کی آب و ہوا کے ناموافق اور وہاں کی فضا

کے لئے غیر مناسب و غیر صالح غذا کھا کر یہاں مزید قیام کی گنجائش نہ تھی حکم ہوا۔ میاں بیوی دونوں زمین پر اتر جاؤ۔ اب وہیں تمہاری نسل بسے بسے گی ہر ایک کے لئے ایک مقدار کی عمر مقرر ہو گی۔ اس کے بعد ہماری طرف واپس آنا ہو گا۔ وہاں ہماری ہدایتیں ہمارے قاصدوں کے ذریعہ سے پہنچتی رہیں گی۔ جو کوئی ہمارے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے گا وہ یہاں آکر ہر طرح آرام پائے گا — دنیا کھیتی ہے اور آخرت حاصل کشت!

انھیں خدائی قاصدوں کا نام پیمبر پڑا۔ اور سب سے پہلے پیمبر حضرت آدم ہی ٹھہرے۔ وہی سب سے پہلے انسان بھی ہیں۔ جو زمین پر آئے اور وہی سب سے پہلے نبی ہیں۔ جو خدا کا قانون زمین پر لائے — آدم کا زمانہ تاریخ کی پیدائش سے قبل کا زمانہ ہے۔ اور ہمارا آسمانی نوشتہ ان کی زمینی زندگی کے متعلق بے نتیجہ تفصیلات میں نہیں پڑتا۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وہ روئے زمین پر ملک سراندیپ میں آباد ہوئے۔ آج اسی کو سیلون کہتے ہیں۔ اہل فن کے قرائن و قیاسات یہ کہتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے انسانی آبادی کی بنیاد ملک عراق، یا دجلہ و فرات کے دوآبہ میں پڑی۔

اولادیں آپ کی حضرت حوّا کے بطن سے متعدد ہوئیں۔ توریت میں نام تین بیٹوں کا آتا ہے۔ قابیل۔ ہابیل۔ شیث۔ اور یہ حضرت شیث آگے چل کر پیمبر بھی ہوئے توریت ہی کی روایت ہے کہ آپ نے عمر ۹۳۰ سال

کی پائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نبی اول کی سرگزشت حیات ختم ہوگئی۔ قرآن مجید نے چند سبق جو اس سادہ روداد حیات کے ذریعہ سے دیدیئے ہیں۔ کچھ ضمناً اور کچھ مستقلاً وہ بجائے خود اس قابل ہیں کہ ایک نظر ان پر بھی ہوتی جائے پہلی بصیرت تو یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کی ہستی ذات باری سے بالکل جدا اور متمایز ہے۔ اور وہ ذات پاک اس سے بالکل منزہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ کوئی رشتہ مشارکت یا مجانست کا رکھے۔ آدم بس آدم ہی تھے۔ خدا یا دیوتا۔ معبود اکبر یا معبود اصغر کسی معنی میں بھی نہ تھے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ کیا کسی نے انسان کو خدا یا جزو خدا بھی سمجھا ہے؟ جی ہاں اس دنیا میں ایسے دانشمند بھی آباد ہیں۔ قوموں کی قومیں مشرکوں کی ایسی گزر چکی ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اول جو تھا، دیوتا ہی تھا۔ اب بھی قبیلہ در قبیلہ ایسے ہیں جو انسان کے جد اول کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن نے آفرینش آدم کا قصہ بیان کرکے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب کاری لگادی۔ اور یہ تعلیم عام کردی کہ مخلوق اور خالق کے درمیان رشتہ داری کیسی؟ آدم اور آدم آفرین کے درمیان بجز وجود کوئی شے مشترک ہی نہیں۔

دوسری تعلیم یہ ملتی ہے۔ کہ آدم خلق ہوئے ہیں۔ نیست سے ہست ہوئے ہیں۔ عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی مادہ موجود تھا۔ آدمؑ کا

قالب اس سے ترکیب دے لیا گیا۔ نہ یہ کہ پہلے سے حیوانی نوع میں موجود تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ نوع کے سب سے ترقی یافتہ فرد کا نام آدمؑ ٹھہرا دیا گیا عقیدہ کی یہ دونوں گمراہیاں پہلے بھی عام رہ چکی ہیں۔ اور آج بھی خدا معلوم کتنے مشرک مزاج انہیں گمراہیوں کے شکار ہیں۔

تیسرا سبق یہ ملتا ہے۔ کہ آدم اللہ کے عبد اور خلیفہ تھے۔ اس کے مظہر یا اوتار نہ تھے۔ قوانین تکوینی کے پابند، احکام شرعی کے مکلف، بالکل اسی طرح جیسے آپ کے بعد سے سارے آدم زاد آج تک چلے آ رہے ہیں۔ مشرک قوموں کے نزدیک، مشرکانہ مذہبوں کے نزدیک انسانیت اور الوہیت گویا ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ فرق صرف اعلیٰ اور ادنیٰ کا ہے۔ قرآن نے شرک کی یہ ریڑھ کی ہڈی توڑ کر رکھدی۔

چوتھی ضرب اس قصہ نے ملائکہ پرستی پر لگادی۔ مشرک قومیں اپنے عقیدہ میں دیوتا انہی ہستیوں کو کہتی تھیں۔ اور انہیں عالم میں متصرف اور کائنات کے مختلف شعبوں میں حاکم سمجھتی تھیں۔ اسلام نے آکر بتایا کہ قوت تصرف اور قدرت تو الگ رہی۔ ملائکہ کا علم بھی کامل نہیں انسان کی طرح وہ بھی قیاس اور فراست ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ اور انسان ہی کی طرح ان کا علم بھی خدائی تصحیح کا محتاج رہتا ہے۔

پانچواں علم یہ حاصل ہوا کہ بشر کی ہستی اپنے خالق کے مقابلہ میں اس سے

بھی زیادہ حقیر و پست ہے۔ جتنی آفتاب کے مقابلہ میں ذرہ کی ہوتی ہے تاہم مخلوقات میں بشر کا مرتبہ سب سے افضل سب سے اعلیٰ ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کو حکم ہوا ہے انکی تعظیم کا۔ انسان کا جھکنا ملائکہ پرستی کی جانب، عناصر پرستی کی جانب، کواکب پرستی کی جانب، اصنام پرستی کی جانب، ذہن بشری کی پستی کا اور فہم انسانی کے انحطاط کا آخری نقطہ ہے۔

چھٹا پہلو یہ ہے کہ کوئی انسان بزرگ سے بزرگ بھی خطا و میلان عصیان سے محفوظ نہیں اجتہادی لغزشیں پیمبروں تک سے ممکن ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جس کا تعلق اللہ سے جتنا زیادہ جڑا ہوا اور مضبوط ہوتا ہے، اسی نسبت سے جلد تر وہ سنبھل جاتا ہے۔ اور نبی کو معصیت پر جمنے نہیں دیا جاتا۔

ساتویں بات یہ معلوم ہوئی کہ معصیت یا لغزش کے بعد توبہ کا دروازہ بالکل کھلا رہتا ہے۔ اور اگر ندامت دل سے ہے، تو اس داغ کو دھلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اور توبہ کے بعد مرتبۂ مقبولیت پر بحالی ہوجاتی ہے

آٹھواں مسئلہ یہ حل ہوا کہ قبول توبہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ معصیت جسمانی ومادی اثرات بھی زائل ہوجائیں۔ اور تکوینی وطبعی نتائج سے رہائی مل جائے

نواں سبق یہ حاصل ہوا، اسی قصہ کے ضمنی قصہ واقعۂ ہابیل سے، کہ محض بزرگ زادگی ہرگز کام نہیں آتی۔ قابیل حضرت آدمؑ کا آخر صلبی ہی بیٹا تھا، اپنی قوت ارادی کو صحیح مصرف میں نہ لایا۔ اختیار سے صحیح کام نہ لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قتلِ انسانی، برادرکشی جیسی خونی معصیت سے اپنے ہاتھ رنگین کئے۔

دسویں بات کام کی یہ معلوم ہوئی۔ کہ آدمؑ و نسلِ آدمؑ اپنے خالق کی نظر میں ایک معزز مخلوق ہے۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ اس پر آیت ناطق ہے۔ نعوذ باللہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ میاں انسان کو بنا کر پچھتائے ہوں۔ اور افسوس کیا ہو کہ میں نے ناحق ایسی مخلوق بنا ڈالی! —— یہ مفروضہ کوئی موہوم نہیں یہودیت جیسے قدیم و مستند اور مسیحیت جیسے عالمگیر، دونوں مذہبوں کی کتابِ مقدس میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے۔

"خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا!"
(پیدائش ۶:۶)

(۲) نوحؑ و سفینۂ نوحؑ

حضرت آدم پر اب فاتحہ خیر پڑھیئے۔ اور ان کے بیٹوں۔ پوتوں سے نظر بچاتے ہوئے سفینہ نوح تک پہنچ جایئے۔ حضرت نوح فرزند تھے لامک کے۔ اور حسب روایت توریت آپ کا سلسلۂ نسب حضرت آدمؑ تک دسویں پشت میں پہنچتا ہے۔ قرآن مجید نے آپ کی عمر نوسو پچاس سال کی بتائی ہے اس وقت کے متوسط عمر کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت انگیز بھی نہیں۔ اور آپ کا خاندان تو اپنی درازیٔ عمری کے لئے مشہور بھی تھا۔ آپ کے والد کی عمر ۷۷۷ سال کی ہوئی تھی۔ آپ کے دادا کی ۹۶۹ سال کی۔ اور اس سے اوپر کی پشتوں میں بجز ایک کے اور سب ہی کی عمر نوسو سال سے کچھ کم یا زائد ہی ہوئی ہے توریت میں یہ ساری تصریحتیں موجود ہیں۔ اور ان کی نفی پر کوئی ایک شہادت بھی موجود نہیں۔ آپ کا

وطن وہی تھا جو اس وقت تک انسانیت کا وطن تھا یعنی دجلہ فرات کا دوآبہ اب اسے عراق کہتے ہیں پہلے کبھی کالڈیا یا کلدانیہ نام تھا۔ اور کبھی بابل یا Baby lonia شمالی سرحدیں آرمینا سے ملی ہوئیں۔ آدم کا خاندان اس وقت تک اتنا پھیلا ہوا کہاں سے ہو سکتا تھا، کہ سارے روئے زمین کو یا بڑے بڑے براعظموں کو گھیر لے کل دس ہی نسلیں تو انسان کے وجود میں آئے ہوئے ہوئی تھیں۔ جتنی بھی انسانی آبادی تھی، سب کے لئے وہی عراق کا زرخیز علاقہ بہت تھا۔ لیکن اب جنت سے نکلے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ خود وہاں کی کچھ بھی باقی نہیں رہی تھی، روحانیت کی بلندیوں کی جگہ لے لی تھی مادیت کی پستیوں نے، زمینی رنگینیوں نے شیطانی دلچسپیوں نے۔ بدعملی سے گزر کر نوبت بدعقیدگی تک پہنچی، اور جو توحید کی منادی کرنے بھیجے گئے تھے۔ وہ سکھے خود دیویوں کے آگے سب جھکنے، دیوتاؤں کے آگے گرنے۔ آج دنیا میں ترقی تمدن کا ایک بڑا معیار بت تراشی و مجسمہ سازی sculpture ہے۔ عظمت و اقبال کا یہ پیمانہ آج سے ۵ ہزار سال قبل کی بھی "مہذب" دنیا میں رہ چکا ہے۔ نوح کی "مہذب و متمدن" قوم نے اپنے بلند پایہ اسلاف کے، اپنے قومی (Heroes) کے مجسمے بنالئے کہ ان سے ان کے کارناموں کی یاد قائم رہے گی۔ یادگار دیکھتے دیکھتے پرستش گاہیں بن گئیں۔ اور بڑے بڑے تارے اور بڑے بڑے پرند اور خدا معلوم خاک بلا اور کیا کیا، بے تکلف پوجے جانے لگے ب... خلیفۃ اللہ اپنے

مرتبہ اور مقام کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

نوح نے سمجھایا، بجھایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ ناصحوں کی اب کب سنی جاتی ہے۔ جو اُس وقت سنی جاتی۔ زبان نے کبھی زبان سے ہار مانی ہے، دلیلِ صحیح کے جواب میں کج بحثی، برہانِ عقلی و نقلی کے مقابلہ میں کٹھ حجتی۔ خیر! اگر نوح کی پکار کو سنی اَن سنی کرتے رہتے، جب بھی غنیمت تھا۔ عند نے اور اُلٹی مخالفت پیدا کر دی کہ یہ کیسا تاریک خیال ہے۔ خواہ مخواہ حائل ہو رہا ہے۔ ہماری روشن خیالیوں کی، آزادیوں کی راہ میں۔ فتوے کفر و شرک کے لگا رہا ہے ہمارے آرٹ کے کمالات پر ہمارے لطیف جذبات پر! مخالفت نے عداوت کا رنگ پکڑا۔ اور اب اپنے اصلی دوست اور حقیقی خیر خواہ کے ساتھ وہ برتاؤ شروع ہوا۔ جو کٹر دشمنوں، شدید بد خواہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ——— پیمبر بھی بشر ہی ہوتا ہے۔ بشر نے عاجز ہو کر، ہر تدبیر سے تھک کر، ہر کوشش سے مایوس ہو کر آخر دعا خالقِ بشر سے کی۔ جواب ملا کہ بحرِ عصیاں میں ڈوبی ہوئی قوم پانی کے عذاب سے ہلاک، طوفان سے غرق، ہو کر رہے گی۔ تم اپنے اور اپنے والوں کے لئے سفینۂ نجات کی تیاریاں کرو۔

حضرات انبیاء کو آج کل کے "توکل پیشہ" نذر و نیاز کے منتظر، خانقاہ نشین مشائخ یا تکیہ داروں پر قیاس نہ کیا جائے۔ یہ حضرات بڑے باعمل بڑے مستعد بڑے کارگذار ہوا کئے ہیں۔ جہاز سازی کے فن میں آپ اناڑی، انیلے نہ تھے،

ایک خاصہ بڑا جہاز اوپر نیچے تین درجوں کا تیار کر لیا۔ توریت میں اس کی پیمائش تک دی ہوئی ہے۔

"اس کی لمبائی ۳۰۰ ہاتھ اور اس کی چوڑائی ۵۰ ہاتھ اور اس کی اونچائی ۳۰ ہاتھ کی" (پیدائش ۶: ۱۵)

گویا اتنا بڑا جہاز جیسے آج مسافروں کے جہاز یا Liners برطانیہ اور امریکہ کے درمیان عموماً چلا کرتے ہیں۔ لیکن جس لفظ کا ترجمہ اردو توریت میں "ہاتھ" کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے (cubit) آتا ہے اور (cubit) کا طول و عرض، عمق خود ہی گفتگو کی بڑی گنجائش رکھتا ہے اس لئے اوپر کی پیمائش کو قطعی نہ سمجھئے۔ بعض دوسری روایتوں میں اس کی دوگنی پیمائش ملتی ہے۔ اگر اسے قبول کیا جائے۔ تو سفینۂ نوحؑ برطانیہ کے بڑے جہازوں کوئین میری (queen Mary) وغیرہ سے بھی کہیں بڑا ٹھہرتا ہے

بارش کے خالق کا حکم ہوا۔ اور ادھر زمین کے سوتے اُبل پڑے، اُدھر بادلوں کے منھ کھل گئے۔ توریت کی روایت ہے کہ دن، رات، ۴۰ دن تک ہفتہ کی جھڑی لگی رہی۔ زمین کے اندر سے جو پانی اُبلا اس کا حساب ہی نہیں۔ جل تھل بھر گئے۔ پانی اونچا ہوا۔ سروں سے اونچا ہوا۔ گھروں سے اونچا ہوا۔ درختوں کو چھپا لیا۔ حد یہ ہے کہ پہاڑوں کو ڈھانپ لیا۔ سفینۂ نوح، کہتے ہیں کہ پانچ مہینے تک یا یہ الفاظ توریت ۱۵۰ دن تک سطح آب پر رواں رہا۔ وہی اس وقت

دنیا کے پردہ پر ایک نجات گھر تھا۔ جو اس میں سوار ہوا بچ گیا۔ جو باہر رہا ڈوب مرا۔ راہ میں نوحؑ کو اپنا لڑکا کنعان نظر پڑا، تیرتا ہوا، سطح آب کو چیرتا ہوا کسی طرف کو نکلا جا رہا ہے۔ آواز دی "جان پدر! یہ سیلاب کی موجیں نہیں قہر الٰہی کی فوجیں ہیں، ہلاکت سے امن آج کہیں نہیں۔ پناہ صرف میرے سفینہ میں ہے؟" لڑکا باپ کی نسل سے تھا۔ باپ کے دین پر نہ تھا۔ قوت کے زعم اور پندار کے نشہ میں بڑھتا چلا گیا۔ محبت سے بے چین باپ نے دعا کی۔ کہ بار الٰہا! رحم مجھ سے تو وعدہ یہ ہو چکا ہے کہ میرے والے سب کے سب بچائے جائیں گے اور اس سے بڑھ کر میرا والا اور کون ہو سکتا ہے۔ جواب ملا۔ کہ نوح! خبردار۔ وہ تم سے ہی پر تم پر نہیں پڑا۔ وہ تمہارا والا ہے کب؟ تمہارے والے تو وہ ہیں جو تم پر ایمان رکھتے ہیں۔" یہ ارشاد ہوا اور مومن باپ کی آنکھوں کے سامنے کافر بیٹا۔ غریق رحمت ہونے کے۔ بجائے غریق لعنت ہو کر رہا۔

عذاب الٰہی کی بے پناہی، معاذ اللہ! جب چاہیں پانی سے آگ کا کام لے لیں، اور جو زندگی کا سہارا ہے، اسی کو ہلاکت کا واسطہ بنا دیں۔ پانی جس کے حکم سے برستا تھا اور ابلتا تھا، بالآخر اسی کا حکم پہنچا آسمان کو کہ بارش تھم جائے اور زمین کو کہ پھر سے خشک ہو جائے۔ فوراً تعمیل ہوئی۔ اور کشتی کوہستان ارارط کی ایک چوٹی جبل جودی پر جا ٹھہری۔ توریت میں ہے کہ کشتی ارارا ط کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔ اور توریت کے شارحین کا کہنا ہے کہ توریت کا حوالہ

تو مبہم (Indefinite) سا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۲، ص[illegible])
عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب نے اس ابہام کو صاف کر دیا۔ متعین طور پر نام
جودی کا لے دیا۔ اور آج بیان، قرآن کے مفسروں کا نہیں، بائبل کے علماء
کا یہ ہے کہ پڑوس کے رہنے والے اور مقامی واقفیت رکھنے والے" کہ عام
خیال کشتی کے رکنے کے مقام کے لئے اسی (جودی) کا ہے"۔ (ہیسٹنگز
ڈکشنری آف دی بائبل، جلد اول ص[illegible])

اور انہیں کی زبان یہ گواہی بھی دے رہی ہے کہ

"شہادت اس کی موجود ہے کہ جس پہاڑی پر کشتی پڑی تھی وہ جبل
جودی ہی ہے۔ جھیل (Van) کے جنوب و مغرب میں"۔

(انسائیکلو پیڈیا ببلیکا۔ کالم ۲۹)

ایک زمانہ تھا۔ اور اسے ابھی بہت روز نہیں ہوئے ہیں، کہ طوفانِ نوح
کا نام زبان پر لانا "روشن خیالی" کو تمسخر و استہزاء کی دعوت دینا تھا۔ پر اللہ کو
کرنا کہ انیسویں صدی کی "روشن خیالی" اس بیسویں صدی میں خود قابلِ مضحکہ ٹھہر
گئی۔ اور جو زبانیں فرشتوں کی لائی ہوئی وحی کی تکذیب و انکار پر دلیر تھیں،
انہیں گنگ ہو جانا پڑا۔ زمین والوں کی شہادتیں سن سن کر، اور طبقات الارض
(جیولوجی) اور اثریات (آرکیالوجی) والوں کے بیانات پڑھ پڑھ کر تحقیق یہ ہوا کہ
طوفانِ عظیم بجنسہٖ وقوع سے تھا۔ آج مشہور و معروف ماہر اثریات،

سر لیونارڈ وولی (woolley) کہتے ہیں:۔

اور کی سرزمین سے معقول شہادت اس کے وقوع کی بہم پہنچ گئی ہے
سیلاب بہت وسیع تھا لیکن مقامی تھا۔" (وولی کی ابراہام، صفحہ ۱۷)

"اُور" علاقہ عراق کا قدیم مشہور شہر تھا۔ گویا طوفان کا نفس وقوع
اور بہت بڑے پیمانہ پر وقوع سائنس کے اس نمائندہ کو بالکل تسلیم ہے
دوسرے محقق سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں:۔

"اثری تحقیقات نے .... طوفان کے وقوع کو ثابت کر دیا ہے۔"

اور ویلیمیا بن کی تازہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"لینگڈن نے جو کھدائی شہر کش میں اور وولی نے شہر اُور میں
۱۹۲۹ء میں کی۔ اس نے ایک عظیم الشان اور بے مثال طوفان
کے وقوع کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے۔" (صفحہ ۲۲۶)

ایک نہیں متعدد شہادتیں آپ نے سائنس کی زبان سے سن لیں۔
اب صرف تعین باقی رہ جاتا ہے۔ وقت اور مقام کا، مکان اور زمان کا۔
توریت کے نسخہ سبعینیہ[1] (septuagint version) کا جو ترجمہ عبرانی
سے یونانی میں کوئی تین سو سال قبل مسیح ہوا تھا۔ اس کے حوالہ سے

---

[1] اس ترجمہ میں ستر یا بہتر علماء ماہرین شریک تھے۔

مشہور ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش سنہ ۱۰۴۲ طوفانی میں ہوئی تھی۔ اور حضرت ابراہیم کی تاریخ ولادت سنہ قبل ولادت مسیح کے حساب سے معلوم ہے۔ اس حساب سے طوفان کی تاریخ تقریباً سنہ ۳۲۰۰ ق.م قرار پائی ہے۔ یعنی آج سے سمجھئے کوئی ۵۱۴۲[1] سال قبل! بعض اور تخمینے اور روایتیں سنہ ۲۴۰۰ ق.م سے متعلق بھی ہیں

طوفان کی عالمگیری کی مدعی بائبل ہو تو ہو۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں۔ قرآن تو صرف یہ کہتا ہے کہ نوح کی امت دعوت یعنی بدکاروں نافرمانوں کی ساری ہی قوم ڈبو دی گئی۔ اور وہ قوم عراق عرب اور نواح آرمینیا کے علاقوں میں آباد تھی۔ طوفان بہ طور عذاب تھا اور عذاب ظاہر ہے کہ صرف نافرمانوں پر ہی آتا ہے۔ اس لئے اگر آج پانچ ہزار سال قبل کے دریائی جانوروں کے ڈھانچے اہل فن کو صرف ارارات کی چوٹیوں پر نظر آئے ہیں۔ اور سائبیریا کے برفستان میں یا راجپوتانہ کے ریگستان میں نظر نہیں آئے ہیں۔ تو اس سے ضرر قرآن کریم کے کسی دعوے کو شمہ برابر بھی نہیں۔ یہاں تک کہ لفٹننٹ کرنل (Wagstaff) کے خیال کے مطابق طوفانی علاقہ کا رقبہ اگر صرف ۴۰۰ میل طول میں اور ۱۰۰ میل عرض میں ثابت

---

[1] سنہ ۱۹۵۲ء میں ۵۱۵۲ سال۔

ہے جب بھی مطلق مضایقہ نہیں۔ وہ قوم بس اسنے ہی رقبہ میں آباد ہوگی
—— البتہ ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ خود نسل آدم کی آبادی بھی تو اس وقت اسی خطہ تک محدود تھی۔ اور انسان کا خاندان اس کے آگے پھیلا ہی نہ تھا! اس لئے سچ کہا ہمارے مفسروں اور محدثوں میں سے جس نے بھی کہا کہ طوفان نوح نے سارے عالم انسانی کو غرق کر دیا۔

حدیث میں نوح کے لئے لفظ اول الرسل کا آیا ہے۔ یعنی آپ دنیا کے سب سے پہلے رسول تھے۔ نبی کہتے ہیں ہر صاحب وحی کو (وحی لفظی معنی میں نہیں اصطلاحی معنی میں) اور رسول کے لئے ضروری ہے کہ صاحب وحی ہونے کے ساتھ ہی صاحب شریعت بھی ہو۔

حضرت آدمؑ کے وقت میں تمدن اپنی انتہائی سادہ شکل میں تھا احکام بھی وقت کے مناسب حال ویسے ہی سادہ۔ مستقل شریعت کی مفصل و مکمل احکام کی ضرورت تو حضرت نوح کے زمانہ سے پڑی۔ اور آپ پہلی شریعت لے کر آئے اور اب جو انسانی آبادی ہے، آپ ہی کی نسل سے ہے۔

حکمتیں، عبرتیں، بصیرتیں آپ کے قصہ میں بہت سی ہیں۔ سب کو سمیٹنے اگر بن نہیں پڑتا۔ تو سب کو چھوڑتے بھی نہیں بنتا۔

پہلی بات یہ ہے۔ کہ پتھر میں جو نمک جس طرح مادی دنیا میں نہیں لگتی، روح و اخلاق کی دنیا میں بھی نہیں لگتی۔ اپنیا سے بڑھ کر پرا ثر تبلیغ

اور مخلصانہ کوشش کس کی ہو سکتی ہے. لیکن مخاطبین کے دل جب فسق علمی و اعتقادی کی کثرت و شدت سے پتھر بن جائیں، تو ہر آواز ایسے کانوں کے لئے بے کار ہی رہتی ہے۔

حضرت نوح کو تبلیغ کے لئے مدت کتنی وسیع ملی۔ لیکن سننے والوں کو اپنی اصلاح منظور نہ ہوئی۔ اس لئے پیمبر کی بھی ساری کوششیں بے اثر رہیں۔ انسان خود جب تک قبول حق کے لئے نہ تیار ہو۔ ناصح کی ہر تبلیغ گویا چکنے گھڑے پر پانی کا پڑنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غفلت و انکار کے لئے مہلت ملتی ہے۔ لیکن وہ مہلت بھی غیر محدود نہیں ہوتی۔ ایک مدت موعود کے بعد عذاب الٰہی کے حرکت میں آنے کا وقت آجاتا ہے یہ وقت موعود، فرد و جماعت دونوں کے ڈرنے کی چیز ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ (پروانہ راہداری) نسل و خاندان نہیں، ایمان و عمل ہے۔ کنعان سے بڑھ کر پیمبر زادہ اور کون ہو گا؟ پیر زادہ، مرشد زادہ۔ شیخ زادہ نہیں پیمبر زادہ تھا۔ لیکن جب قابیل کی طرح نافرمانی پر تل گیا۔ تو سابقہ اسی قانون سے پڑا۔ جو ہر آدم زاد کے لئے رکھدیا گیا ہے۔ ہلاکت سے نہ کوئی مادی تدبیر بچا سکی، نہ کوئی نسبی قرابت۔

چوتھا سبق یہ ہاتھ آیا۔ کہ اس عالم اسباب میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے پردہ اسباب ظاہری کا رکھا جاتا ہے۔ نوح و آل نوح کو طوفان سے بچالیا گیا، تو سفینۂ نوح ہی کے واسطے سے۔

پانچویں تعلیم یہ حاصل ہوئی۔ کہ پیمبر اپنے علم میں، قدرت میں، اختیار میں، بشریت کے حدود سے سرمو باہر نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کا اتنا بھی بس نہ چلا۔ کہ اپنے ڈوبتے ہوئے فرزند ہی کو بچا لیتے۔ یا اسے ایمان لانے پر مجبور کر چھوڑتے۔ اور یہ تو خیر پھر دور کی چیزیں رہیں۔ آپ کو اس کے انجام کا علم تک قبل سے نہ ہو سکا۔

(۳) ابراہیم خلیلؑ

داستان نوحؑ ختم ہوئی۔ اب دنیا از سر نو آباد ہے۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ چل رہا ہے، پھیل رہا ہے، بڑھ رہا ہے۔ ہدایت اور ضلالت دونوں کے سلسلے جاری ہیں۔ نئے نئے ملک آباد ہو چکے ہیں۔ قومیں بن چکی ہیں، اور بگڑ چکی ہیں۔ گر چکی ہیں، اور ابھر چکی ہیں۔ حضرت ادریسؑ اور ان کی تعلیمات۔ حضرت ہودؑ اور ان کی امت قوم عاد، حضرت صالحؑ اور ان کی امت قوم ثمود، یہ سب عنوانات دلچسپ بھی ہو سکتے تھے اور سبق آموز بھی لیکن آج کی مختصر و سرسری صحبت میں اتنی گنجائش کہاں؟ تاریخ مسلسل کے ان سارے درمیانی اوراق کو الٹ جائیے۔ اور اب نبی محترم ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ کے دور میں آجائیے۔

جہل و بے خبری بھی عجیب چیز ہے اور دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جو وحی کے منکر ہوتے ہیں، وہ خود علم و عقل کے بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ زیادہ نہیں چالیس ہی پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ "روشن خیالوں" نے حضرت ابراہیمؑ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہ اس نام کی کوئی شخصیت ہی نہیں گزری ہے۔ اور یہ نام تو کوئی نام شیخ قبیلہ کا ہے "حضرت ابراہیم" یہود و مسیحی دونوں قوموں کے مستند پیمبر اور مسلّم امام ہیں، وہ ان دونوں کے "عقلیت زدہ روشن خیالوں" نے بے تامل اپنی محققانہ کتابوں میں، اپنی انسائیکلوپیڈیاؤں میں یہی رنگ قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور کچھ عجب نہ تھا، کہ یہ بلا ہمارے ہاں بھی پہنچ جاتی کہ زمانہ نے ایک اور کروٹ لی۔ تحقیقات کا رُخ بدلا۔ اور زبردست اثری شہادتوں کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ۔ ان کا وطن، ان کا مذہب یہ سارے نظریات پھر از سر نو حقایق بن گئے۔

آپ کی پیدایش قدیم کلدانیہ یا موجودہ عراق کے شہر اُور میں ہوئی شہر کا صرف نام اب تک توریت کے صفحات میں محفوظ تھا۔ نفس شہر جغرافیہ کے نقشوں سے مدت ہوئی غائب ہو چکا تھا۔ سینکڑوں نہیں۔ ہزاروں سال غائب رہنے کے بعد اب پھر نمودار ہو گیا ہے۔ کھدائی کے کام کی داغ بیل تو ۱۸۵۴ء ہی میں پڑ چکی تھی۔ ہوتے ہوتے آخر ۱۹۲۲ء میں جو زبردست

آخری مہم برٹش میوزیم اور امریکہ کی (Pennsylvania) یونیورسٹی کے مشترکہ سرمایہ سے روانہ ہوئی۔ اس نے کھدائی کا کام برابر سات برس تک جاری رکھا۔ اور اس کے خاتمہ پر دسمبر ۱۹۲۹ء میں اس مہم کے صدر سر لیونارڈ وولی (Woolley) نے ایک مستقل کتاب Ur of the Chaldeans کے نام سے لکھ دی۔

عراق کے محکمۂ آثار قدیمہ نے پورے شہر کو عجائب خانہ کے حکم میں لا کر اسے محفوظ کر دیا ہے۔ خلیج فارس کے ساحل سے شمال و مغرب کے رُخ پر دریائے فرات کے کنارے کنارے چلئے۔ تو پایۂ تخت یعنی شہر بغداد ابھی آدھی دور باقی ہوگا کہ آپ اُور کے محاذ میں پہنچ جائیں گے۔ اب دریا کا ساتھ چھوڑ کر جانب مغرب اور چلئے۔ ۲۰ میل پر بغداد بصرہ ریلوے لائن کو عبور کریں گے۔ اور یہاں تک آپ کو جا بجا آبادی ملتی رہے گی۔ کہیں کہیں کھیتی باڑی اور کہیں کہیں کچے مکان اور جھونپڑے۔ آپ اسی سمت قدم بڑھائے چلئے۔ اب بالکل ویرانہ شروع ہو جائے گا۔ دشت و میدان ایک ہو کا عالم۔ ڈیڑھ میل اور چلئے چلئے۔ اب آپ کے قدم اُور کے کھنڈروں پر پڑنے لگے۔

یہ تھا وہ مقام جو آپ کی ولادت سے مشرف ہوا۔ کسی زمانہ میں بڑا متمدن شہر تھا۔ آثار تمدن کثرت سے زمین کے تہ خانوں سے برآمد ہوئے

ہیں۔ توریت کی روایت ہے، کہ آپ کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہے۔ یعنی آپ ان کی گیارہویں پشت میں ہیں۔ البتہ دوسرے قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ توریت کے دیئے ہوئے نسب نامہ میں کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ آپ کا سال ولادت سر چارلس مارسٹن کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ سنہ ق۔م ہے۔ اور عمر شریف جیسا کہ توریت میں درج ہے ۱۷۵ سال کی ہوئی۔ سنہ وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ سنہ ق۔م ٹھہرتا ہے۔

دنیا، متمدن دنیا، کا مذہب اس وقت بھی شرک کا تھا۔ حکومت کا مذہب مشرکانہ، قوم کے رسوم و آداب مشرکانہ۔ جس گھرانے میں آپ نے آنکھیں کھولیں۔ ایسا ہی چرچا ہر طرف شرک بت پرستی کا بھی اور کواکب پرستی کا بھی۔ اصلی معبود آسمان میں لٹکے ہوئے۔ ان کی مورتیں پتھروں کی گھڑی اور تراشی ہوئی زمین پر مندروں کی رونق۔ دیوی دیوتاؤں کی مورتیں اس لئے کہ خود ان کی پوجا کی جائے، ان پر چڑھاوے چڑھائے جائیں

نبی برحق کے والد کا نام تھا تارح یا عربی تلفظ میں آزر۔ نام کا تلفظ قدیم ماخذوں میں کئی کئی طرح آیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے آزر کافی ہے۔ اپنے زمانہ کے بڑے صناع یا آرٹسٹ تھے۔ بے جانوں میں اپنی صنعت گری سے جان ڈال ڈالتے تھے۔ مورتیاں پتھر کی، اور شاید لکڑی کی بھی اس صناعی

سے تراشتے، کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

چراغ پہلے گھر میں جلتا ہے۔ بیٹے نے تبلیغ کی ابتدا باپ ہی سے کی۔ بولے: "ابا جان! یہ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ پوجا ان مورتیوں کی کرتے رہتے ہیں؟ انھیں پکاریے۔ تو سن نہ سکیں، کچھ دکھایئے تو انھیں سوجھ نہ پڑے۔ کسی کام میں ان کی مدد چاہیے تو آپ کے کام نہ آسکیں۔ صلاح میری مانیے۔ راہ میری اختیار کیجیے۔ مجھے وہ علم و ہدایت کی روشنی مل چکی ہے۔ جو آپ تک نہیں پہنچی ہے۔ ان شیطانی خرافات پر لعنت بھیجیے۔ نہیں تو پھر آپ ہی بعد کو پچھتایئے گا۔"

باپ بگڑ کر بولے کہ "تو اپنے ہوش میں ہے؟ بد مذہب تو خود ہو چکا ہے اور چلا ہے الٹا مجھے نصیحت کرنے۔ بس رہنے دے اپنا وعظ۔ اپنی خیریت چاہتا ہے تو چپکا رہ، نہیں تو مارے پتھراؤ کے برا حال کر دوں گا۔" سعادت شعار بیٹے نے جواب دیا کہ "خیر آپ کو اور آپ والوں کو تو چھوڑتا ہوں، باقی آپ کے حق میں دعا جاری رکھوں گا۔"

قرآن، ابراہیمی زندگی کا ایک منظر اور دکھاتا ہے۔ آپ نے ایک روز کیا کیا، کہ ایک تاروں بھری رات میں صحن میں آ گئے۔ زحل اور مشتری، مریخ اور عطارد اور زہرہ یہ سب ہی پوجے جا چکے ہیں، اور اب بھی پوجے جا رہے ہیں۔ انھیں میں سے یا کسی اور بڑے روشن تارے کی طرف نظر

چلا کر بولے، کہ ہو نہ ہو۔ یہی تارا میرا دیوتا ہے۔ دیوتا بننے کی صلاحیت ہے تو اسی میں۔ رات کچھ اور بڑھی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ تارا بھی کھسکا! آئیں! یہ کیا؟ یہ تارا بھی آزاد و خود مختار نہیں، کسی آئین میں جکڑا ہوا کسی قانون کا پابند، کسی کے احکام کا محکوم ہے۔ اور لیجئے۔ روشنی بھی تو اس کی ماند پڑنے لگی۔ لاحول پڑھ آپ نے اُدھر سے منھ پھیرا۔ چاند نکلا، اور رات کی اندھیریاں اُجالے سے بدلیں۔ اہا، یہ چندرماں دیوتا تو دنیا کے شرک کے برت جانے پہچانے ہوئے ہیرو ہیں۔ قوموں کی قومیں ان کی خدائی کی قائل ہوئی ہیں اور واقعی ان کی عظمت کا، ان کی نورانیت کا کیا ٹھکانا، مگر لیجئے یہ کیا؟ ارے یہ بھی تو لگے تاروں ہی کی طرح جھلملانے، سرکنے اپنی جگہ چھوڑنے، اور رفتہ رفتہ بے نور ہونے! لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی خدائی ہے؟ یہ تو صاف نقشہ ہے بندگی کا، بے بسی کا، بے چارگی کا، چلئے، چھوڑیئے انھیں بھی۔ اب کی بھی کیسا دھوکا ہوا تھا۔ لیکن اب دھوکا نہ ہو گا وہ دیکھئے تا خسرو خاوری کا نور اقبال، ظہور اجلال! رات کی سیاہ چادر تو آمد آمد ہی سے کافور ہو گئی۔ یہ بے شک اس قابل ہے۔ خدائی اس کی مانی جائے، اور اپنی بندگی اور چاکری کی نسبت اس سے جوڑی جائے۔ ہندی اور جاپانی، مصری اور ایرانی، رومی دیونانی آخر سب ہی نے ان سورج دیوتا کو مانا ہے اور اپنے دھرم کا چراغ انھیں سے

روشن کیا ہے۔ فکر و استدلال کی یہ کڑیاں پر کڑیاں ملتی جاتی تھیں۔ کہ لیجئے اُدھر وقت زوال آگیا، عروج کل دوپہر کا! عروج کے بعد زوال، اور زوال کے بعد غروب! آئے دن کا مشاہدہ، اور زبان فطرت کا روزمرہ! وہ جو بینائی کو خیرہ کردینے والا نور مجسم تھا۔ خلق کی نظر میں محکم تھا معظم تھا۔ لگا زرد رو مجرم کی طرح منہ چھپانے، افق کے دامن میں پناہ لینے، یہاں تک کہ بالکل غائب! پتہ نشان ڈھونڈھے بھی نہ ملے! — زبان حق ترجمان، شرک کے منظروں سے عاجز و پریشان بے ساختہ پکار اُٹھی۔

یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ، اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

اے میری قوم والو! تم جو کچھ اور جس کسی کو بھی خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں اس سے بری ہوں بیزار ہوں! کیسا آفتاب اور کہاں کا ماہتاب! میں نے اپنی لو لگائی ہے۔ اس ہستی سے جو خالق ہے آسمان اور زمین کا (اور اُن سب پر حاکم و متصرف) اور میں مشرکین کے دین سے بالکل تبری کرتا ہوں، ہو سکتا ہے (جیسا اکثر مفسرین کا خیال ہے)، کہ یہ ماجرا ابراہیم کی کسنی کا ہو، فطرت سلیم شروع ہی سے لے کر آئے تھے۔ آخر آگے چل کر نبی ہونے ہی والے تھے۔ اور ہو سکتا ہے (جیسا قرآن کے لفظ یٰقوم، آپ کے تخاطب

قوم سے تبادر ہوتا ہے) کہ آپ نے پیمبری کے بعد اس استدلال کا مظاہرہ قوم کے سامنے اس کی رہنمائی کے لئے کیا ہو۔

بہرحال اس کے بعد کی منزل وہ تھی جو پیش آنا ہی تھی۔ یعنی وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ مشرک قوم ٹوٹ پڑی موحد پر، بحث و حجت کے بجائے کج بحثی اور کٹھ حجتی کے لئے۔ ڈراوے اور دھمکیاں اس پر مستزاد۔ آپ نے فرمایا أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ۔ ارے تم چلے ہو توحید جیسی صاف، صریح حقیقت میں مجھ سے بحث وجدال کرنے، اور پھر جب اللہ مجھے ہدایت سے سرافراز کر چکا! یہ ہے تمہارے ڈراوے اور دھمکیاں، سو خدا کی شان کہ تم تو نہ ڈرو میرے طاقت و قوت والے ہمہ تواں خدا سے، اور میں ڈر جاؤں تمہارے بے طاقت، ناتواں، خود ساختہ معبودوں سے!

قوم کی مخالفت اب زوروں پر ہے۔ اور ابن آزر کی دعوت توحید ورد شرک اب کوئی صیغۂ راز نہیں۔

ایک روز آپ کے دل میں آیا۔ کہ ان بے وقوفوں کو سبق علانیہ دیجئے اور ان کی مشرکانہ حماقت کا اظہار ان پر برملا کیجئے۔ دن اُن کے میلہ کا آپڑا میلے ٹھیلے تو مشرک قوموں کی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ وہ میلہ تھا کہیں شہر سے باہر۔ چھوٹے بڑے سب کھنچے چلے جا رہے تھے۔ آپ نے ہانک پکار کر کہہ دیا، اور کسی کسی نے آپ کی آواز سن بھی لی۔ کہ "اچھا۔ جا تو رہے ہو، لیکن

خدا کی قسم میں بھی تمہارے پیچھے تمہارے بتوں کی گت بنا کر رکھ دوں گا،
(تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ)

اِدھر وہ گئے، اُدھر میدان خالی پا آپ ان کے دیوہرے میں گھس گئے۔ اور ایک ہتھوڑی لے سب کو توڑ پھوڑ دیا، بجز بڑی مورتی کے کہ آخر تو تحقیق ہوگی ہی۔ اس وقت خوب موقع قایل کرنے کا ہے گا۔ (فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ)

میلہ واپس ہوا۔ اور پجاریوں نے آکر اپنے معبودوں کی یہ گت بنی ہوئی دیکھی، ہل چل پڑ گئی، لگے آپس میں کہنے۔ کہ یہ کس بے ادب، نالایق کی حرکت ہے؟ (قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ)

بعضے بعضے بول اٹھے کہ ہو نہ ہو حرکت اسی نوجوان ابراہیم نامے کی ہے سنا نہ تھا اس کو ہم نے، وہی تو ہمارے ٹھاکروں کی شان میں بے ادبی کے کلمہ بک رہا تھا (قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِیْمُ)

تلاش ہوئی اور آپ مجمع کے سامنے پکڑے آئے (قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ) پوچھ پاچھ آپ سے شروع ہوئی (قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ) آپ تو اس موقع کی تاک ہی میں تھے۔ اس بڑے بت کی طرف اشارہ کرکے بولے کہ "جی اور کیا کہیں۔ یہ حرکت ان بڑے صاحب کی تو نہیں۔ اِن سے پوچھ دیکھئے نا۔

یان تو یہ بہر حال ث ہی سکتے ہوں گے! ـــــ انداز بیان تمامتر طنزیہ ایسے
د تمع کے لئے مناسب حال بھی، موثر بھی۔

مجمع ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے مشتعل بھی ہوا ہوگا اور منفعل بھی توحید کے
ایسے درس ابراہیم کے ہاں روزہی ہوا کرتے تھے۔ قرآن مجید کے واسطے سے
ان تبلیغی تقریروں اور خطبوں کے ٹکڑے محفوظ رہ گئے ہیں۔ کبھی آپ فرماتے
کہ تمہاری عقلیں کیسی ماری گئی ہیں۔ اللہ کو چھوڑ چھاڑ تم کس کی پوجا میں
لگے رہتے ہو؟ وہ جو ذرہ بھر بھی نفع پہنچا سکے۔ نہ نقصان۔ تف ہے
تمہارے اوپر اور تمہارے بے بس معبودوں پر (اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) اور کبھی جب دیکھتے کہ مخاطبین نے اچھا خاصہ ہجوم کر لیا ہے
تو فرماتے، کہ اللہ تمہارا خالق، تمہاری ذات کا، صفات کا، افعال کا خالق
پھر تمہاری عقلوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ جن مورتوں کو اپنے ہاتھوں گڑھتے
ہو، تراشتے ہو، انہیں کی لگ جاتے ہو پوجا کرنے (فَاَقْبَلُوْا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ
قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ)

حضرت ابراہیم کی نبوت کے، فضیلت کے، تقدس کے قائل جس طرح
مسلمان ہیں۔ اسی طرح یہود اور مسیحی بھی ہیں۔ لیکن آپ کی زندگی کے دور،
عراقی میں آپ کی اس توحید پرستی اور آپ کی تذکیر و تبلیغ کے تذکرے

صرف قرآن مجید ہی کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ باقی بائبل والوں کے ہاں تو گویا یہ موضوع کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا!

بادشاہ کو پتہ لگا، کہ ایک شخص اس عجیب و غریب عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور سرکاری مذہب سے بغاوت کر رہا ہے۔ رعایا تو خیر مشرک ہی تھی، بادشاہ سلامت چشم بد دور مرکز شرک! یعنی خود ہی سب سے بڑے دیوتا کے اوتار۔ رعایا سے اطاعت ہی کے نہیں، پرستش کے بھی طلب گار! ——

مشرک قوموں کے ہاں یہ دستور انوکھا نہیں عام ہے —— آپ دربار میں پہنچے، طلبی پر، یا بلا طلب (قرآن اپنے حکیمانہ انداز بیان کے مطابق یہ درمیانی غیر ضروری کڑیاں حذف کرتا جاتا ہے) اور بادشاہ سے دو بدو گفتگو شروع ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ وہ کون ہے۔ آپ کا عجیب و غریب۔ اَن دیکھا پروردگار اور معبود! ذرا اس کے اوصاف تو سنوں؟ آپ نے فرمایا۔ "اوصاف اس کے وصف تو آفتاب سے بڑھ کر روشن ہیں۔ سارے نظام کائنات کا وہی تو مالک و مختار ہے۔ موت و زندگی کا سارا کارخانہ اسی کے دست قدرت میں تو ہے۔ وہی جس کو چاہے جلائے۔ وہی جس کو چاہے مارے"!

مشرک بادشاہ کا دماغ ہی کتنا۔ بے مغز آپ کے استدلال کے مغز تک نہ پہنچا، صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لے کر بولا۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ یہ تو میری قدرت کے تحت میں ہے۔ روز کیا ہی کرتا ہوں (وقَالَ اَنَا اُحیِی وَاُمِیتُ)

جس کی چاہوں جان لے لوں جس کو چاہوں جان بخش دوں" قرآن مجید میں بس اتنا ہی ہے روایات تفسیری میں آتا اور آتا ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت پیدا کرنے کو اسی وقت اس نے ایک خونی مجرم کی جان بخشی کر دی، اور ایک بے گناہ کو قتل بھی کرا دیا۔ بہر صورت جب ابراہیم نے دیکھا کہ مخاطب اتنا نافہم ہے۔ تو آپ نظام عالم سے جو استدلال کر رہے تھے۔ اس کو آپ نے ایک آسان تر مثال میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا جسے یہ تو بتائیے۔ کہ یہ آفتاب جو میرے اور اپنے سب کے پروردگار کے ہمہ گیر قانون کے مطابق روز سمت مشرق ہی سے طلوع ہوتا رہتا ہے آپ کے بس میں ہے کہ اس کی رفتار کو گھما دیں اور آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے نکل آئے؟ (قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ) یہ مثال اتنی عام فہم تھی۔ کہ اس کے بھی سمجھ میں آ گئی جواب دے ہی کیا سکتا تھا؟ لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ قرآن کی بے نظیر منظر نگاری میں (فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ)

ان چند متفرق منظروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ آپ کی عراقی زندگی توحید کی تبلیغ کے لئے وقف تھی۔ تبلیغ گھر والوں پر بھی باہر والوں پر بھی۔ عوام کو بھی خواص کو بھی، سربازار بھی، سر دربار بھی۔ لیکن یہ دہیمی دہیمی آنچ کب تک جلتی۔ مخالفت کے شعلے بھڑکے اور عداوت کے شرارے بلند

ہوئے حکومت کے مذہب (State Religion) کی تحقیر جمہور کے عقاید کی تردید کوئی معمولی بات ہوتی ہے؛ حکم ہوا کہ یہ ہمارے خداؤں کا دشمن ہمارے دیوتاؤں کا باغی یوں نہ مانے گا۔ ایک بڑا آتشکدہ تیار کرا کر اس میں اسے جھونک دو۔ جل بھن کر خاکستر ہو جائے۔ اس دور تمدن میں ایسی سزائیں شاذ نہیں عام تھیں۔

تیاریاں ہوئیں۔ سامان ہوئے۔ آپ آگ میں پھینکے گئے۔ لیکن جب آگ تک پہنچے۔ تو لپکتے ہوئے شعلے آپ کے حق میں سبزہ وگلزار تھے (قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ) آگ نام کسی فاعل مختار کا نہیں۔ وہ بھی آخر کسی کے حکم ہی کے تابع ہے۔ اور جس کی تابع ہے۔ اسی کا یہ حکم پہنچ چکا تھا۔ کہ خبردار! کوئی گزند ابراہیم کو نہ پہنچنے پائے۔ جو عشق میں ڈوبے ہوئے، آتش توحید میں تپے ہوئے آپ پہلے ہی سے تھے۔ اس مادی آگ کی بھٹی میں پڑ کر اور نکھر گئے ——— امتحان وفا اتنا کڑا، اتنا گراں، اور کس نے دیا؟ خلقت کے امتحان میں اس سے اچھے نمبروں میں اور کون پاس ہوا؟ خلیل اللہ کا لقب آپ کو نہ ملتا۔ تو اور کس کو ملتا؟

حکمت الٰہی میں اب وقت آ گیا تھا، کہ آپ وطن سے بے وطن ہوں اور اپنے ملک سے ہجرت کریں۔ اتنی شدید مخالفت اور عداوتوں کے بعد آپ ملک میں رہ سکتے بھی کیونکر تھے؟ چلے ہی، تو ساتھ میں آپ کی

زوجہ محترمہ حضرت سارہ تھیں، اور آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ۔ انہی کوششوں اور کاوشوں کا حاصل کل یہی دو نو تھے ہی۔ انہیں دو نے تو آپ کو سچا جانا تھا شرک کو چھوڑ کر توحید کو مانا تھا۔ ہاں خادموں اور غلاموں کی پوری جماعت اگر ہمرکاب ہو تو کچھ عجب نہیں آخر آپ شیخ القبیلہ بھی تو تھے۔ اور توریت میں تصریح ہے۔ کہ جانوروں، مویشیوں کے بہت سے گلے آپ کے ساتھ تھے۔ بہرحال منزل در منزل سفر کرتے، راہ میں توحید کا درس دیتے اپنے مالک کی بڑائی پکارتے، آپ ملک شام میں پہنچے۔ اور پھر اس کے مغربی علاقہ میں آئے جو اب فلسطین کہلاتا ہے۔ توریت میں ہے کہ اس سفر کے وقت آپ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ اور آپ کا سال ولادت اوپر گزر چکا ہے کہ ۲۱۶۰؁ ق م تھا۔ اس حساب سے آپ فلسطین میں ۲۰۸۵؁ ق م میں وارد ہوئے۔ جب وہاں قحط پڑا، تو آپ مصر چلے آئے۔ یہاں کا بادشاہ آپ کا ہم نسب نکلا۔ اور تجربہ کے بعد آپ کی ذاتی بزرگی کا بھی قائل ہو گیا۔ رخصت کے وقت علاوہ اور بیش قیمت تحفے تحائف کے اس نے اپنی لڑکی کو بھی خدمت میں پیش کر دیا۔ زمانہ کے دستور کے مطابق یہ کہہ کر کہ یہ کنیز آپ کی اور بڑی بیوی صاحبہ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔" یہی شہزادی ہاجرہ آپ کی دوسری بیوی تھیں۔ اور انہیں کو ناخدا ترس یہود نے تو گھٹا کر باندی یا لونڈی مشہور کر دیا۔ حضرت ہاجرہ کے فضائل اور

وہ فضائل جو یہود کو مسلّم ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کا ذکر حضرت اسمٰعیل کے ذیل میں کبھی سنئے گا۔

حضرت کا سن اب ۸۵۔ ۸۶ سال کا ہو چکا تھا۔ اس وقت کے اوسط عمر کے لحاظ سے یہ سن بڑھاپے کا نہ تھا۔ تاہم جوانی تو گذر ہی چکی تھی۔ تمنا آپ کو قدرتاً پیدا ہوئی کہ اپنا جانشین صالح چھوڑ جائیں۔ دعا کی قبول ہوئی (رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ. فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ) ۲۰۷۴ ق م اپنی حرم ثانی سے صاحبزادہ ہوئے۔ اور وہ اسمٰعیل کہلائے۔

حضرت ابراہیم مصر سے عرب آ چکے تھے۔ حضرت اسمٰعیل کے مولد میں اختلاف ہے۔ مولد فلسطین ہو یا عرب۔ بہر حال اسی قدر مسلّم ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل قریب بلوغ کے پہنچ لئے۔ اور حضرت ابراہیم کا سن ۱۰۰ سال کا ہو چکا، تو اب خیال پڑا، بیوی حضرت سارہ کو بھی اولاد کا ہو فرشتوں نے آ کر بشارت دی، کہ اولاد ہوگی۔ چنانچہ حضرت اسحٰق کی ولادت ہوئی۔ ان کا سال ولادت ۲۰۶۰ ق۔م ہے۔ اب تک حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ میں خوب بن رہی تھی۔ اور حضرت سارہ اپنا لڑکا حضرت اسمٰعیل ہی کو سمجھ رہی تھیں۔ لیکن اب دونوں صاحب اولاد تھیں۔ حضرت ابراہیم اب آئندہ نباہ کے لئے یہی بہتر سمجھے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حضرت سارہ سے دور ملک عرب میں لا کر

رکھیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا اور اپنی بھی آمد و رفت برابر عرب میں جاری رکھی، زندگی کے عراقی دور اور فلسطینی دور کے بعد عربی دور آپ کی زندگی کا گزر رہا تھا، کہ آپ کو عالم رویا میں حکم ملا، کہ اپنے اکلوتے فرزند کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ یہ "اکلوتے بیٹے" کا لفظ قرآن کا نہیں۔ خود توریت کا ہے۔ پیمبروں کے خواب بے معنی نہیں بامعنی ہوتے ہیں۔ قلب اتنا صاف ہو چکا ہوتا ہے، کہ حواس ظاہری اور شعور کے تعطل کی حالت میں بھی جو نقش اس لوح پر آ کر جمتا ہے، وہ باطل نہیں، صحیح ہی ہوتا ہے۔ صبح اُٹھ باپ نے بیٹے سے خواب بیان کیا۔ اور بولے "خواب سن چکے۔ جان پدر! اب اپنی رائے بتاؤ"۔۔۔ دنیا کی تاریخ میں کیوں کسی باپ نے اپنے بیٹے اور اکلوتے لاڈلے بیٹے سے خود اسی کے قتل کے باب میں مشورہ کیا ہوگا؟۔۔۔ ابراہیم جیسے شفیق، رحمدل اور رقیق القلب باپ نے نہ سہی کسی شقی القلب اور بیدرد باپ نے بھی کیا ہوگا؟ لیکن بیٹا بھی کس باپ کا تھا، اور کس نامور ترین انسان کا مورث اعلیٰ بننے والا تھا۔ جواب دیا۔ بے جھجک اور بے دھڑک، کہ "ابا جان! حکم خدا وندی کے بعد صلاح و مشورہ کیسا؟ کر گزریئے بے تامّل جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے۔ رہا میں تو اپنے اور آپ کے رب ہی کے بھروسہ پر کہتا ہوں۔ کہ ثابت قدم رہوں گا۔" اب کیا تھا (قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ)

بیابان میں باپ نے ذوق پر پہنچے والے اکلوتے بیٹے کو ذبح کے جانوروں کی طرح ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹا دیا. چھری تیز کی۔ اور روایتوں میں آتا ہے کہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری بیٹے کے حلقوم پر چلائی کہ وحی الٰہی کی آواز آئی. کہ ہو چکی آزمائش. ابراہیم ہو چکی. تم نے خواب کو سچ کر دکھایا لو یہ مینڈھا اس کے بجائے ذبح کرو. تمھاری قربانی قبول ہوئی اور تمھاری یادگار سلام و رحمت کے ساتھ ہم نے آیندہ نسلوں میں چلا دی۔

چنانچہ آج مسلمان جو بے شمار جانوروں کی قربانیاں کرتے رہتے ہیں، روئے زمین کے گوشہ گوشہ میں اور اسلام کے عین مرکز میں ذی الحجہ کی دسویں اور گیارہویں اور بارہویں کو یہ سب یادگار ہیں اسی ذبح عظیمؑ کی!

یہی ذبیح اللہ جب ذرا اور بڑے ہوئے. تو باپ اور بیٹے دونوں نے مل کر دنیا کے شرکستان میں خدائے واحد کی عبادت کا گھر تعمیر کیا. باپ کی نگاہ کشفی نے دیکھ لیا کہ تجلیات جمالی و کمالی کا مرکز بیت المعمور کے مقابل روئے زمین پر عرب کے ملک میں حجاز کے علاقہ میں وادی مکہ ہے بیٹے کو ساتھ لئے بغیر انجینیروں اور معماروں اور مہندسوں کی مدد کے، ایک مربع نما مستطیل عمارت کھڑی کر دی. وہی عمارت کعبہ کہلاتی ہے جو آج تک ملت ابراہیمی کا قبلہ اور ہر توحید والے کا قبلہ. عمارت کیا بس ایک عظیم الشان کمرہ ہے. کوئی ۵۰ فٹ لمبا، ۴۰ فٹ چوڑا، اور ۴۰-۵۰ فٹ اونچا۔ اسمٰعیلؑ

کی عمر اس وقت اگر ۲۰ سال کی فرض کی جائے۔ تو اس بنائے ابراہیمی کی تاریخ کوئی ۲۰۵۴ سنہ ق۔م قرار پاتی ہے۔ یعنی آج سے کوئی چار ہزار سال قبل یہ محض تخمینہ ہے باقی اس بیت العتیق کی نفس قدامت اس کے مخالفین یہود و نصاریٰ تک کو تسلیم ہے۔

مزدوروں[1] کو اکثر دیکھا ہوگا۔ جب کام کرتے جاتے ہیں۔ تو کچھ گنگناتے بھی جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کے مزدور جس وقت اللہ کے گھر کی بنیادیں بھر رہے تھے، دیواریں کھڑی کر رہے تھے تو یہ بھی اپنی زبانوں پر مہر لگائے ہوئے نہ تھے۔ جس کا گھر بنا رہے تھے۔ اسی سے کچھ مانگتے بھی جاتے تھے۔ ہاتھ مشغول تعمیر میں بیت کے۔ اور دل یاد میں رب البیت کے۔ دل میں جس کی یاد زبان پر اس کا نام۔ بے آب وگیاہ سرزمین کی چلچلاتی دھوپ میں، دنیا کی کسی طمع کے بغیر۔ پتھر پر پتھر جوڑتے جاتے تھے اور دل کے سوز وگداز کے ساتھ تو یقیناً۔ اور آنکھوں کی تراوٹ کے ساتھ غالباً زبانیں اسی ذکر میں مشغول تھیں رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اے ہمارے رب، ہم سے قبول فرما! ہماری یہ خدمت قبول فرما! بے شک تو ہی

---

[1] یہاں سے لے کر تین پیروں تک کا بیشتر حصہ ماخوذ ہے۔ راقم سطور کے سفر حجاز صـ۲۲۱ و صـ۲۲۲ سے۔ (صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ)

تو سننے والا (منہ سے نکلے ہوئے بولوں کا) ہے اور جاننے والا (دلوں کی نیتوں کا)" اللہ اللہ! یہ شان فنا ہوتی ہے۔ اللہ پر قربان ہونے والوں کی اللہ کے خلیل کہلانے والوں کی! اپنے کو مٹا چکے ہیں۔ مٹا رہے ہیں، پھر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا، کہ دیکھئے یہ اپنے کو مٹانا بھی قبول ہوتا ہے یا نہیں!

دنیا کے کس مزدور نے وہ مزدوری مانگی جو بیت اللہ کے اس بڑے مزدور نے مانگی؟ کس نے وہ مزدوری پائی جو بیت اللہ کے اس بڑے مزدور کے حصہ میں آئی؟ مزدوری کی طلب، مزدوروں کو تنہا اپنے لئے نہ تھی۔ ہمارے لئے تھی۔ آپ کے لئے تھی۔ اُن سب کے لئے تھی، جو اپنی کوئی بھی نماز بغیر اس مقدس مزدور پر درود و سلام بھیجے۔ تمام نہیں کر سکتے ہیں۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا دے، اپنا کر لے اور ہماری اولاد سے ایک امت کی امت پیدا کر اپنی فرمانبرداری اپنی مُسلم۔ ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما۔ بیشک تو ہی تو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے (ماضی میں) اور بڑا مہربان (مستقبل میں)، ابراہیم کی، دعا کہیں خالی جا سکتی تھی؟ مزدور کو تو جو مزدوری ملی، اس کا حال وہ خود جانے، یا اس کا دینے والا، البتہ اس گھر کا طواف کرنے والوں کو، اس کی

طرف منہ کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے والوں کو اس کی محبت وعظمت کو دل میں جگہ دینے والوں کو کیا کچھ نہیں مل سکتا؟ کیا کچھ نہیں مل جاتا؟ کیا کچھ نہیں مل چکا ہے؟

گھر کی عزت اور عظمت کو، برکت ورحمت کو، سب ہی دیکھتے ہیں۔ دوست مانتے ہیں۔ دشمن صرف جانتے ہیں۔ کم لوگ یہ ذہن میں رکھتے ہیں کہ بنانے والے کا خمیر کس اخلاص وفنائیت کی مٹی سے ہوا تھا۔ روم کا مشہور ومعروف عارف کہتا ہے ؎

کعبہ را کش ہر دمے عزت فزود — آں ز اخلاصات ابراہیم بود
فضل آں مسجد ز خاک وسنگ نیست — لیک در بناش حرص وجنگ نیست

اور بالکل سچ کہتا ہے، کہ کعبہ کی عزتوں اور فضیلتوں میں تم ہر لحظہ جو ترقی وبرتری دیکھتے ہو۔ یہ ابراہیم ہی کے اخلاص وصدق نیت کا ثمرہ ہے، وہی پتھر اور وہی مٹی۔ آخر ہر مسجد بلکہ ہر عمارت میں تو لگے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ اس میں کوئی اور نئی چیز نہیں۔ نئی چیز یہی ہے کہ اس کا بنانے والا نہ کوئی انجینئر تھا، نہ کوئی مہندس۔ نہ کوئی بادشاہ نہ امیر، بلکہ وہ تھا جو خودی کو یکسر مٹا چکا تھا۔ اپنے کو مٹا چکا تھا۔ اپنے کو تمام تر خدا کا بنا چکا تھا۔

تصوف کی ان لطافتوں سے اور ملاحتوں سے پھر آجائیے تاریخ کی ٹھوس خارجیت کی طرف۔ جامد واقعیت کی طرف، حضرت سارہ کی عمر جب ایک سو ستائیس ١٢٧

سال کی ہوئی۔ تو حسب روایت توریت انھوں نے انتقال فرمایا۔ اور ہبرون (Hebron) میں مدفون ہوئیں۔ اب اسی کو خلیل الرحمٰن یا صرف الخلیل کہتے ہیں۔ بیت المقدس سے کوئی ۲۰ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب میں ایک چھوٹا سا شہر کوئی ۱۰ ہزار کی آبادی کا ہے ان کے انتقال کے بعد آپ نے ایک اور شادی بی بی قطورہ کے ساتھ کی۔ ان سے چھ اولادیں ہوئیں۔ اور ان کی نسل سے ۱۶ قبیلہ چلے۔ قرآن نے جنھیں اصحاب مدین کہا ہے، وہ وہی لوگ تھے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر جمیل اس کثرت سے اور اتنے موقعوں پر آیا ہے، کہ سب کو سمیٹنا اس مختصر صحبت میں ممکن نہیں احادیث اور تفسیری روایات کا جو ذخیرہ ہے وہ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے امتحان لیا ابراہیم کا چند باتوں میں وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ وہ باتیں کون سی تھیں، اور امتحان کی نوعیت کیا تھی، یہ تفصیلات درج ہیں نہ ان کے معلوم ہونے کی ضرورت بہرحال سب امتحانات میں پورے اترے فَاَتَمَّهُنَّ انعام یہ ملا کہ عالم انسانیت کی امامت ان کے سپرد کردی گئی۔ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ امامت بھی۔ اللہ اللہ کیسی امامت سیکڑوں نہیں ہزاروں سال گذر چکے۔ بابل و نینوا کا نام و نشان تک مٹ چکا۔ اور اہل توحید ہیں کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں، نماز کی نیت جب باندھیں گے منہ کریں گے،

ابراہیم کے بنائے ہوئے کعبہ کی طرف۔ سالانہ قربانی جہاں کہیں پیش کریں گے حوالہ زبان پر ابراہیم کے نام کا لائیں گے (کما تقبلت من خلیلک ابراھیم) حج کرنے جائیں گے تو سجدہ کریں گے مقام ابراہیم پر۔ نماز کے آخر میں سلام و رحمت بھیجنے بیٹھتے ہیں، تو نام اپنے رسول سے بھی پہلے لیتے ہیں۔ ان کے انھیں جد مکرم کا۔ اور اکیلے اہل توحید ہی نہیں۔ یہود بھی اپنی بگڑی ہوئی توحید، اور مسیحی بھی اپنی برائے نام توحید کو لئے ہوئے کلمہ پڑھ رہے ہیں دم بھر رہے ہیں۔ اللہ کے اسی برگزیدہ بندہ کا! —— کوئی حد ہے انعام کی؟ اور کیوں ہو؟ جب بندہ کی طرف سے کمی نہ ہو اخلاصات میں تو مولیٰ کی طرف سے کوئی کسر کیوں اٹھ رہے انعامات میں!

حد یہ ہے کہ قرآن میں یہ آگیا ہے۔ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنا لیا۔ خلیل، کا ترجمہ دوست سے کرنا، خلت کے مرتبہ کو بہت ہلکا کر دینا ہے۔ توریت میں بھی ایک نہیں دو مقامات پر لیکن دونوں جگہ ضمناً، ابراہیم کو خدا کا دوست کہا ہے (یسعیاہ ۴۱: ۸، اور ۲ تواریخ ۲۰: ۷) اور اسی پر انجیل والوں کا بھی ایمان ہے —— خالق اپنے مخلوق کو قادر علی الاطلاق اپنے بندہ محدود کو اپنا خلیل کہہ کر پکارے! سرفرازیوں اور عزت افزائیوں کی بس انتہا ہے! خود قرآن ہی میں نہ آگیا ہوتا تو کوئی بندہ تو اپنی طرف سے ایسا لقب تراشنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا۔ فیاضی،

مہمان نوازی، نرم دلی، شفقت خلق کی روایتوں اور حکایتوں سے یہودی اور اسلامی لٹریچر دونوں لبریز ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے قصہ کے ضمن میں تصریح ہے۔ کہ فرشتے انسانی لباس میں آپ کے پاس آئے۔ آپ کے لئے وہ اجنبی محض تھے۔ لیکن فوراً ہی آپ اُن کے سامان ضیافت میں لگ گئے۔

ش۱۹۸۵ء ق م میں بیٹوں اور پوتوں کی موجودگی میں سکینت اور اطمینان کے ساتھ ۱۷۵ سال کی عمر میں جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ اور اب الخلیل کے بیرون حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف وغیرہم کے ساتھ زیر خاک آسودہ ہیں۔ یہ تربتیں ایک تہ خانہ کے اندر ہیں اور غار کا دروازہ بند ہے۔ ایک روایت مشہور یہ ہے کہ ترکوں کے عہد حکومت میں ایک ترک والی شام نے فرط عقیدت سے اندر اترنا چاہا۔ جانے کو تو چلا گیا۔ لیکن باہر آیا تو اپنے حواس میں نہ تھا۔ کسی نے مجذوب قرار دیا۔ اور کسی نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ کا کچھ حصہ مشاہدہ میں آگیا۔

تمت